البلاغ
سرپرست:
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

ھذا بلاغ للناس

مُدیرِ اعلیٰ:
محمد تقی عثمانی

صفر المظفر ۱۳۸۹ھ مطابق مئی ۱۹۶۹ء

ذکر وفکر ... ... محمد تقی عثمانی ____ ۴

معارف القرآن

معاشی مساوات کی حقیقت ... . مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ____ ۷

مقالات ومضامین

حضرت معاویہ اور خلافت وملوکیت ... محمد تقی عثمانی ____ ۱۱

اسلام کے چند معاشی اصول ... .. مولانا نور محمد اعظمی ____ ۲۶

رُوسی ترکستان میں سوشلزم ... جناب عبدالکریم عابد ____ ۳۱

پاکستانی بھائیوں کے نام ... ... شیخ محمد سرور الصبان ____ ۵۵

اسلام کا تعلیمی نظام ... ... مولانا رشید احمد ارشد ____ ۴۲

مولانا شبیر احمد عثمانی اور تحریک پاکستان جناب احمد سعید ایم اے ____ ۴۹

شعر وادب

گلہائے نعت ... ... عبرت صدیقی ____ ۵۷

مستقل عنوانات

دِل کی دُنیا ... ... ____ ۵۹

خواتینِ اسلام ... ... مولانا ____ ۶۱

مدیر انتظامی:

خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری

فی پرچہ ۷۵ پیسے

سالانہ: آٹھ روپے

غیر ممالک سے: ایک پونڈ

بذریعہ ہوائی ڈاک: دو پونڈ

مشرقی پاکستان (ہوائی ڈاک): ساڑھے نو روپے

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ:

مولانا ظہور الحسن صاحب خانقاہ امدادیہ، تھانہ بھون ضلع مظفر نگر۔ بھارت۔

ڈاک کا پتہ:

البلاغ، دارالعلوم

کراچی ۱۴ (مغربی پاکستان)

مطبع: مشہور پریس کراچی

جلد ____ ۳

شمارہ ____ ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد و ستائش اُس ذات کے لئے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا!
اور
درود و سلام اُسکے آخری پیغمبر پر جنھوں نے اس جہان میں حق کا بول بالا کیا

عالم اسلام میں بلاشک وشبہ اکثریت ان افراد کی ہے جو اسلام کو ایک جیتے جاگتے نظام زندگی کی حیثیت سے دنیا میں نافذ دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن ہر اسلامی ملک میں دو قسم کے طبقے ایسے پائے جاتے ہیں جو اس مقصد کی راہ میں سالہاسال سے کا وٹ بنے ہوئے ہیں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو دین و مذہب سے بالکل بیزار ہے، اور زندگی کے کسی مرحلے پر اس کی رہنمائی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، کسی سیاسی غرض یا وقتی مصلحت کی بنار پر کہیں اسلام کا نام لینا پڑ جائے تو بات دوسری ہے، ورنہ دل سے وہ دین و مذہب کو ایک فالتو چیز سمجھتا ہے جسکی حیثیت اس کے نزدیک اگلے وقتوں کے افسانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو دل سے تو اسلام کی ضرورت اور اہمیت کا قائل ہے اور اسے یکسر فراموش کر دینا اس کے بس کی بات نہیں، لیکن دوسری طرف وہ وقت کے چلے ہوئے افکار و نظریات سے بھی اس قدر مرعوب ہے کہ ان کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالتے ہوئے ڈر لگتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک شدید ذہنی کشمکش کا شکار ہے، اور یہی کشمکش بسا اوقات اس کو قرآن و سُنت کی معنوی تحریف پر آمادہ کر دیتی ہے۔

یہ دونوں طبقے اگرچہ اپنی عددی قوت کے لحاظ سے اقلیت میں ہیں، اور شاید عالم اسلام کے کسی بھی ملک میں ان کی تعداد راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ نہیں، لیکن شومیٔ اعمال سے یہی طبقے مسلمانوں کے کلیدی مقامات پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کو عالم اسلام کی صفوں میں جو جگہ ملی ہے وہ فکری اور عملی رہنماؤں کی جگہ ہے، اور اس طرح پوری دنیائے اسلام کی باگ ڈور عملاً انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

اس صورتِ حال کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات جس نظامِ تعلیم سے گذر کر اپنے موجودہ مقام تک پہنچے ہیں، وہ بنایا ہی اس لئے گیا تھا کہ اس کے ذریعہ مغرب کی بالادستی کا سکہ ذہنوں پر بٹھایا جائے اور ایسے ذہن تیار کئے جائیں جو دین،

مذہب، خدا، رسول اور وحی و کتاب سے کم از کم علمی طور پر بے نیاز ہوں، جن لوگوں نے اس نظام تعلیم کو مدوّن کیا تھا، وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ حضرات اقلیت میں ہونے کے باوجود عالمِ اسلام کے ناخدا بنے ہوئے ہیں اور ملّت کا مستقبل انہی کے رحم و کرم پر رہتا ہے۔

اگر اسلامی ممالک کی اندرونی سیاست اپنی طبعی رفتار پر حرکت کرے تو یہ صورتِ حال بلاشبہ بدل سکتی ہے لیکن اوّل تو مختلف اسباب کی بنا پر یہاں کی سیاست عموماً اپنی طبعی چال سے محروم رہتی ہے، دوسرے واقعہ یہ ہے کہ اس مرض کا موثر، پائیدار اور اصلی علاج صرف اس طرح نہیں ہو سکتا کہ کچھ عرصے کے لئے حکومت راسخ العقیدہ مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے۔ بلکہ اس کے لئے پرانے ذہن بدلنے اور نئے ذہن تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے کا سارا بگاڑ ذہن کا بگاڑ ہے۔ اور جب تک ذہن کی اصلاح نہیں نہیں ہوگی۔ اُس وقت تک اسلامی نظامِ زندگی کو بروئے کار لانے میں دشواریاں پیش آتی ہی رہیں گی۔

○

ذہن کی اصلاح و تعمیر کا اصل طریقہ تو یہ ہے کہ اپنے نظامِ تعلیم کا پورے قومی شعور اور صحتمند ذہن کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور اس میں ایسی بنیادی تبدیلیاں کی جائیں جو ہمارے اجتماعی مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام وقت چاہتا ہے، اور اس سلسلے میں ہم اپنی تجاویز انشاء اللہ کسی اور صحبت میں پیش کریں گے لیکن علمائے کرام کے کرنے کے کچھ کام ایسے ہیں جو بلا تاخیر ہو جانے چاہئیں۔ اور جن سے موجودہ صورتِ حال کا کچھ نہ کچھ مداوا ہو سکتا ہے۔ آج کی نشست میں ہم چند انہی کاموں کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اس وقت جتنی فکری گمراہیاں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں، ان میں سے بیشتر کا سرچشمہ مغرب ہے، یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد جو فلسفہ پروان چڑھا ہے اُس نے لوگوں کے سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں، اب زندگی کے ہر مسئلے پر اسی طرز اور مزاج کے ساتھ غور کیا جاتا ہے۔ جو مغرب نے گھٹی میں پلا دیا ہے، لہٰذا جن لوگوں کا ذہن اس خاص سانچے میں ڈھل چکا ہے، ان کے دلوں میں کوئی بات اتارنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان کے طرزِ فکر کو پوری طرح سمجھا جائے۔

خلافتِ عباسیہ کے دور میں جس وقت یونانی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا تو اس وقت بھی علماء دین کو کم و بیش اسی قسم کی صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا تھا، جن لوگوں نے اس فلسفے کو مرعوب ذہن کے ساتھ پڑھا، ان کے ذہن و دماغ پر وہی طرزِ فکر اور طرزِ استدلال چھا گیا جو یونانی فلسفے کا پیدا کیا ہوا تھا۔ اُس وقت قرآن و سنت کی تحریف کی جتنی تحریکیں عقلیت کے نام پر اٹھیں، ان کا مقابلہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک اُس فلسفے کو نہ سمجھا جائے جو ان کے افکار کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ اُس دور کے بیدار مغز علمائے دین نے اس فلسفے کا پوری گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا، اور اس کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہونے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اسی زبان اور اُسی طرزِ استدلال میں اس کا مقابلہ کیا۔ امام غزالیؒ اور امام رازیؒ جیسے بزرگوں نے یونانی فلسفے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اور جو لوگ اس نام نہاد عقلیت کے آگے سر ڈال رہے تھے، انھیں فکر و نظر کی نئی راہیں دکھلائیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تجدّد اور تحریفِ دین کی جو تحریکیں اس فلسفے کی بنیاد پر کھڑی ہوئی تھیں ایک ایک کر کے فنا ہو گئیں، اور آج ان کا نام "الملل والنحل" جیسی کتابوں

کی زینت ہو تو ہو، جیتی جاگتی دنیا میں ان کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ جس طرح ماضی میں علمائے دین نے یونانی فکر کے سیلاب کا بر وقت اور موثر علاج کیا تھا، موجودہ مغربی افکار و نظریات کا علاج بھی انہی خطوط پر کیا جاتا، علمائے کرام کی ایک بڑی جماعت مغربی فلسفے کی تہ تک پہنچ کر اسے اچھی طرح کھنگالتی، اور اس کے بعد ان شکوک و شبہات کو حل کرنے کی کوشش کرتی جو نئے ذہن میں صبح و شام کلبلاتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا۔

لیکن اب وقت کے اس اہم ترین فریضے سے صرفِ نظر کرنے کا بالکل وقت نہیں رہا، ہماری نئی نسل جس ذہنی ابتری اور بے راہ روی کی شکار ہے، اگر فی الواقع اسکی وجہ سے ہم دل میں کوئی درد محسوس کرتے ہیں تو ہمیں اول و آخر اس نتیجے پر پہنچنا چاہئے کہ یہ زمانہ کسی "رازی" یا "غزالی" کی تلاش میں ہے۔ اور یہ "رازی و غزالی" کہیں آسمان سے نہیں اتریں گے، یہ گوشت پوست کے انہی انسانوں میں سے پیدا ہوں گے جن میں سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جس طبقے سے انکو پیدا ہونا چاہئے وہ طبقہ دل و جان سے ان کی ضرورت محسوس کرے، اور انہیں حاصل کرنے کے لئے وقت اور جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔

○

برصغیر کے مختلف علاقوں میں جو دینی مدارس اور دار العلوم قائم ہیں، انھوں نے اسلام کی حفاظت کے سلسلے میں بلاشبہ بڑی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، ہم بلا خوفِ تردید یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ دشمنانِ اسلام کی ہزار سازشوں کے علی الرغم یہاں دینِ حق کا جتنا بھی غلبہ ہے، وہ لوٹے پھوٹے بوریوں کی انہی درسگاہوں کے دم سے ہے۔ اور بڑا حقیقت ناشناس اور ظالم ہے وہ شخص جو سادہ سی ان درسگاہوں کو بیکار یا فضول سمجھتا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہمیں فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ان درسگاہوں سے جتنا فائدہ ہم اٹھا سکتے تھے، ہم نے اپنی غفلت کی بنا پر اتنا فائدہ نہیں اٹھایا۔ بیسویں صدی کے جس رازی و غزالی کی ضرورت ہم آج محسوس کر رہے ہیں، اگر ہم پہلے توجہ کرتے تو وہ بھی آج ہمیں ان درسگاہوں سے حاصل ہو جاتے۔ لیکن ابتک ہم نے ان مدارس کے نصاب میں کسی ایسی چیز کا خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا جو علم دین کے طلبا کو فکر مغرب کے جدید رجحانات سے پوری طرح واقف کرا کے اس کی گمراہیوں کی واضح نشان دہی کر سکے۔

اس کوتاہی کی تلافی کا اصل راستہ تو یہ ہے کہ اربابِ مدارس کی ایک جماعت مل کر بیٹھے اور سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرے۔ تاہم چند متفرق تجاویز ہمارے ذہن میں ہیں جنھیں ہم اسوقت علمائے کرام اور بالخصوص دینی مدارس کے اربابِ بست و کشاد کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں:

(۱) سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ ہر مدرسے کے فارغ التحصیل طلبا یا اساتذہ میں سے چند ایسے افراد کا انتخاب کیا جائے جو علومِ دین میں اچھی استعداد رکھنے کے ساتھ ساتھ تحریر و تقریر کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ ان افراد کو انگریزی زبان سے کماحقہٗ واقف کرانے کے بعد ان کے لئے مغربی فلسفہ، معاشیات، قانون اور سیاسیات میں سے کوئی موضوع تجویز کر دیا جائے، جس میں وہ اعلیٰ درجہ کی مہارت حاصل کریں۔ اس دوران علوم دین سے ان کی مناسبت استوار رکھنے کے لئے تدریس کا تھوڑا بہت کام بھی ان سے لیا جاتا رہے۔ جب وہ اپنے موضوع میں تحقیقی کام کرنے کے لائق ہو جائیں تو وہ اپنے موضوع سے متعلق اسلام

کی ہدایات کو جدید انداز میں پیش کرنے اور مغربی افکار کیساتھ ان کا تقابل کرنے کی خدمات انجام دیں۔

(۲) یونانی فلسفے کو درس نظامی سے یکسر خارج کر دینا تو بہت مضر ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے بغیر متاخرین کی دینی تصانیف کو سمجھنا تقریباً ناممکن ہے، البتہ اس کی مقدار میں کمی کرکے اس کی جگہ جدید مغربی فلسفہ کو باقاعدہ داخل نصاب کیا جائے۔

(۳) فقہ کے ساتھ نئی معاشیات اور اصولِ قانون کو بھی داخل نصاب کیا جائے، ہمیں سو فیصد یقین ہے کہ دینی مدارس میں ان موضوعات کو گریجویشن کے معیار تک پڑھانے کے لئے اس وقت کا زائد سے زائد دسواں حصہ صرف ہوگا جو ہمارے کالجوں میں اس مقصد کے لئے صرف ہوتا ہے

(۴) جن مدارس میں جب تک ان موضوعات کی باقاعدہ تعلیم کا بندوبست نہ ہو سکے۔ وہاں کم سے کم اتنا کام تو فوری طور سے کیا جا سکتا ہے کہ ہفتے کے کچھ دن مخصوص کر کے ان موضوعات پر عام تقاریر کرائی جائیں جن میں ہدایہ اور اس سے اوپر کے طلباء شریک ہوں۔

یہ چند سرسری تجاویز ہیں، مزید غور و فکر سے ان کی تفصیلات طے کی جا سکتی ہیں۔ اس وقت ہمارا منشا صرف یہ تھا کہ علمائے کرام اور اربابِ مدارس کو اس رُخ پر سوچنے کی دعوت دی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔

یہ اطلاع تمام علمی و دینی حلقوں میں نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ جناب خلیفہ محمد عاقل صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم عرصۂ دراز تک دار العلوم دیوبند کے درجۂ فارسی و ریاضی میں استاذ رہے ہیں، اس دوران اُن سے ہزاروں افراد نے فیض اٹھایا۔ پھر جب شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے قیامِ پاکستان کے لئے جد و جہد شروع کی تو مرحوم دل و جان سے ان کے ساتھ شریک ہوئے اور پوری لگن، محنت اور جذبے کے ساتھ تحریکِ پاکستان کے لئے کام کیا۔ علامہ عثمانی ہی کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے اور مستقل طور پر کراچی میں سکونت پذیر ہو گئے، عرصۂ دراز سے وہ یہاں اعمالِ قرآنی کے ذریعہ خدمتِ خلق میں مصروف تھے۔ انھوں نے اس راہ سے ہزاروں افراد کو فائدہ پہنچایا۔ اکابر دیوبند کے شیدائی تھے۔ اور دار العلوم کراچی کے خصوصی ہمدرد و معاون ــــ ایسے وضعدار، شگفتہ مزاج، با اصول اور اولوالعزم انسان اب کہاں نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

محمد تقی عثمانی

صفر المظفر ۱۳۸۹ھ

معاشی مساوات کی حقیقت!

والله فضّل بعضكم على بعض في الرزق ؕ فما الذين فضلوا برآدي رزقهم على ما ملكت ايمانهم فهم فيه سواء ط افبنعمة الله يجحدون ۝

"اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے سو جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنے حصہ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح کبھی دینے والے نہیں کہ وہ اسمیں سب برابر ہوجاویں۔ کیا پھر اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں"

خلاصہ تفسیر:

اس سے پہلی آیات میں حق تعالیٰ نے اپنے علم وقدرت کے اہم مظاہر اور انسان پر مبذول ہونے والی نعمتوں کا تذکرہ فرماکر اپنی توحید کے فطری دلائل بیان فرمائے ہیں۔ جن کو دیکھ کر ادنیٰ سمجھ بوجھ والا آدمی بھی کسی مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ اُسکی صفاتِ علم وقدرت وغیرہ میں شریک نہیں مان سکتا۔ اس آیت میں اسی مضمون توحید کو ایک باہمی معاملہ کی مثال سے واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انسانی مصالح کے پیش نظر رزق میں سب انسانوں کو برابر نہیں کیا بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اور مختلف درجات قائم فرمائے۔ کسی کو ایسا غنی بنا دیا جو ساز و سامان کا مالک ہے حشم وخدم غلام وخدمتگار رکھتا ہے۔ وہ خود بھی اپنے منشا کے مطابق خرچ کرتا ہے اور غلاموں خدمت گاروں کو بھی اُسکے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے۔ اور کسی کو غلام وخدمت گار بنا دیا کہ وہ دوسروں پر تو کیا خرچ کرتے ان کا اپنا خرچ بھی دوسروں کے ذریعہ پہنچتا ہے۔ اور کسی کو متوسط الحال بنایا نہ اتنا غنی کہ دوسروں پر خرچ کرے نہ اتنا فقیر ومحتاج کہ اپنی ضروریات میں کبھی دوسروں کا دست نگر ہو۔

اس قدرتی تقسیم کا اثر سب کے مشاہدہ میں ہے کہ جس کو رزق میں فضیلت دی گئی اور غنی بنایا گیا وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنے مال کو اپنے غلاموں خدمتگاروں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ وہ بھی مال میں اس کے برابر ہوجائیں۔

اس مثال سے سمجھو کہ جب مشرکین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بُت

اور دوسری مخلوقات جنکی وہ پرستش کرتے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی
مخلوق و مملوک ہیں تو یہ کیسے تجویز کرتے ہیں کہ یہ مخلوق و مملوک
اپنے خالق و مالک کے برابر ہو جائیں۔ کیا یہ لوگ یہ سب نشانیاں
دیکھ کر اور یہ مضامین سن کر پھر بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو
شریک اور برابر قرار دیتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ
خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں کیونکہ اگر یہ اقرار ہوتا کہ یہ
سب نعمتیں صرف اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں ان میں کسی خود
تراشیدہ بت کا یا کسی انسان اور جن کا کوئی دخل نہیں ہے تو
پھر ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر کیسے قرار دیتے۔۔۔ یہی
مضمون سورۂ روم کی اس آیت میں بھی ارشاد ہوا ہے:

ضرب لکم مثلا من انفسکم هل
لکم مما ملکت ایمانکم من شرکاء
فیما رزقناکم فانتم فیه سواء

(سورۂ روم آیت ۲۸)

"تمہارے لئے تمہی میں سے ایک مثال دی ہے جو
لوگ تمہارے زیر دست ہیں کیا وہ ہمارے دئے ہوئے رزق
میں تمہارے شریک ہیں۔ کہ تم اس میں برابر ہو گئے ہو۔"

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ تم اپنے مملوک غلاموں اور
خدمتگاروں کو اپنے برابر کرنا پسند نہیں کرتے تو اللہ کے لئے
یہ کیسے پسند کرتے ہو کہ وہ اور اس کی مخلوق و مملوک چیزیں اس کے
برابر ہو جائیں۔

معارف و مسائل

معیشت میں لوگوں کے مختلف درجات ہونا حکمت خداوندی اور انسانوں کے لئے رحمت ہے، مگر مروجہ تقسیم کی ناجائز سرمایہ داری شدید جرم ہے:

اس آیت میں واضح طور پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فقر و غنی
اور معیشت میں انسانوں کے مختلف درجات ہونا کہ کوئی غریب ہو
کوئی امیر کوئی متوسط الحال۔ یہ کوئی اتفاقیہ حادثہ نہیں حق تعالیٰ
کی حکمت بالغہ کا تقاضہ ہے اور انسانی مصالح کا مقتضی اور انسانوں
کے لئے رحمت ہے۔ اگر یہ صورت نہ رہے اور مال و سامان میں سب
انسان برابر ہو جائیں تو نظام عالم میں خلل اور فساد پیدا ہو جائیگا
اسی لئے جب سے دنیا آباد ہوئی کسی دور اور کسی زمانے میں سب
انسان مال و متاع کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوئے۔ اور نہ ہو
سکتے ہیں۔ اور اگر کہیں زبردستی ایسی مساوات پیدا کر بھی دیجائے
تو چند ہی روز میں تمام انسانی کاروبار میں خلل اور فساد کا مشاہدہ
ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ نے جیسے تمام انسانوں کو عقل و دماغ اور
قوت و طاقت اور صلاحیتِ کار میں مختلف مزاجوں پر تقسیم کیا
ہے اور ان میں ادنیٰ اعلیٰ متوسط کی اقسام ہیں جس کا کوئی صاحبِ
عقل انکار نہیں کر سکتا اسی طرح یہ بھی ناگزیر ہے کہ مال و متاع میں
بھی یہ مختلف درجات قائم ہوں کہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے
اعتبار سے اس کا صلہ پائے۔ اور اگر اہل صلاحیت اور نا اہل کو
برابر کر دیا گیا تو اہل صلاحیت کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ جب معیشت
میں اس کو نا اہلوں کے برابر ہی رہنا ہے تو وہ کون سا داعیہ ہے
جو اسے جد و جہد اور فکر و عمل پر مجبور کرے، اس کا لازمی نتیجہ صلاحیت کار
کو برباد کرنا ہوگا۔

ارتکازِ دولت کیخلاف قرآنی احکام:

البتہ خالقِ کائنات نے جہاں عقلی اور جسمانی قوتوں میں
بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس کے تابع رزق اور مال میں
تفاوت قائم فرمایا۔ وہیں معاش کا یہ نظام محکم بھی قائم فرمایا کہ ایسا
نہ ہونے پائے کہ دولت کے خزانوں اور کسبِ معاش کے مرکزوں
پر چند افراد یا کوئی خاص جماعت قبضہ کرلے۔ دوسرے اہل صلاحیت
کے کام کرنے کا میدان ہی باقی نہ رہے کہ وہ اپنی عقلی اور جسمانی صلاحیتوں
سے کام لے کر معاش میں ترقی کر سکیں۔ اس کے لئے قرآن کریم
سورہ حشر میں ارشاد فرمایا۔

کیلا یکون دولة بین الاغنیاء منکم

یعنی: ہم نے تقسیم دولت کا قانون اس لئے
بنایا کہ دولت صرف سرمایہ داروں پر منحصر ہو کر نہ رہ جائے

آج کل دنیا کے معاشی نظاموں میں جو افراتفری پھیلی ہوئی

ہے وہ اس ربّانی قانونِ حکمت کو نظر انداز کرنے ہی کا نتیجہ ہے۔

ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں دولت کے مرکزوں پر سُود و قمار کے راستہ سے چند افراد یا جماعتیں قابض ہو کر باقی ساری مخلوق کو اپنا معاشی غلام بنانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ان کے لئے بجز غلامی اور مزدوری کے کوئی راستہ اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لئے نہیں رہ جاتا۔ وہ اپنی علمی صلاحیتوں کے باوجود صنعت و تجارت کے میدان میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ اگر وہ کبھی ایسا جرم کر بیٹھیں تو تجارت اور صنعت کے اصل مرکزوں پر قابض بڑے سرمایہ دار ایک دن میں ان کو وہ سبق دیدیں کہ وہ کبھی بھول کر بھی اس طرف آنے کا خیال نہ کریں اس کے علاوہ سرمایہ کے مرکزوں پر قبضہ کرنے والے پھر اشیاءِ ضرورت کا بھاؤ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور عام خلق خدا کو اشیاءِ صرف کے ایک مصنوعی قحط میں مبتلا کر دیتے ہیں اس طرح عام مخلوق خدا تعالیٰ کو مزدوری پر مجبور کر دینے کے بعد ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ ان کے جائز حقوق بھی ادا نہیں کئے جاتے۔ بہت سے مواقع پر وہ حیوانوں کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دئے جاتے ہیں۔ اشیاءِ ضرورت کی گرانی اور آمدنی کا فقدان یا کمی انھیں اس پر مجبور کرتی ہے کہ وہ سرمایہ داروں کے بے مول غلام بنے رہیں۔ اور اپنی پوری توانائی سے وہ ان کے لئے سامانِ عیش فراہم کرتے رہیں۔

سرمایہ داروں کے اس ظلم و جور کے ردِ عمل کے طور پر ایک متضاد نظام اشتراکیت کمیونزم یا سوشلزم کے نام سے وجود میں آتا ہے۔ جس کا نعرہ غریب و امیر کے تفاوت کو ختم کرنا اور سب میں مساوات پیدا کرنا ہے۔ ظالمانہ سرمایہ داری کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے عوام اس نعرہ کے پیچھے لگ جاتے ہیں مگر چند ہی روز میں وہ مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ یہ نعرہ محض فریب تھا۔ معاشی مساوات کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہُوا۔ اور غریب اپنی غربت اور فقر و فاقہ کی ساتھ بھی جو ایک انسانی احترام رکھتا تھا، اپنی مرضی کا مالک تھا، یہ احترامِ انسانیت بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ نظام اشتراکیت میں انسان کی کوئی قدر و قیمت مشین کے ایک پُرزے سے زائد نہیں۔ کسی جائداد کی ملکیت کا تو وہاں تصوّر ہی نہیں ہو سکتا۔ اور جو معاملہ وہاں ایک مزدور کے ساتھ کیا جاتا ہے اس پر غور کریں تو وہ کسی چیز کا مالک نہیں۔ اس کی اولاد اور بیوی بھی اس کی نہیں بلکہ سب ریاست کی مشین کے پُرزے ہیں۔ جن کو مشین اسٹاٹ ہوتے ہی اپنے کام پر لگ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ریاست کے مفروضہ مقاصد کے سوا نہ اس کا کوئی ضمیر ہے نہ آواز۔ ریاست کے جبر و تشدد اور ناقابلِ برداشت محنت سے کراہنا ایک بغاوت شمار ہوتا ہے جسکی سزا موت ہے۔ خدا تعالیٰ اور مذہب کی مخالفت اور خالص مادہ پرستی نظام اشتراکیت کا بنیادی اصُول ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن سے کوئی اشتراکی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے پیشواؤں کی کتابیں اور اعمال نامے اس کے شاہد ہیں کہ ان کے حوالوں کو جمع کرنا بھی ایک مستقل کتاب بنانے کے مترادف ہے۔ اس جگہ اشتراکیت کا فلسفہ اور اس پر نقد و تبصرہ کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ قدرت کے بنائے ہوئے نظام فطرت کے خلاف جو بھی کوئی ازم یا نظام بنایا جاتا ہے اس کی رسوائی اور ناکامی تھوڑے ہی عرصہ میں سامنے آجاتی ہے۔

قرآن حکیم نے ظالمانہ سرمایہ داری اور احمقانہ اشتراکیت کی دونوں انتہاؤں کے درمیان افراط و تفریط سے پاک ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ رزق اور دولت میں فطری تفاوت کے باوجود کوئی فرد یا جماعت عام مخلوق کو اپنا غلام نہ بنا سکے۔ اور مصنوعی گرانی اور قحط میں مبتلا نہ کر سکے سُود اور جوُئے کو حرام قرار دیکر ناجائز سرمایہ داری کی بنیاد منہدم کر دی پھر ہر مسلمان کے مال میں غریبوں کا حق متعین کر کے شریک کر دیا جو غریبوں پر احسان نہیں بلکہ ادائی فرض ہے۔ آیت فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم اس پر شاہد ہے۔ پھر مرنے کے بعد مرنے والے کی تمام ملکیت کو افراد خاندان میں تقسیم کر کے ارتکاز دولت کا خاتمہ کر دیا۔ قدرتی چشموں، سمندروں اور پہاڑی جنگلوں کی خود رو پیداوار کو تمام خلق خدا کا مشترک سرمایہ قرار دے دیا۔ جس پر کسی فرد یا جماعت کا قبضہ مالکانہ جائز نہیں جبکہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ چیزیں

صرف سرمایہ داروں کی ملکیت قرار دیدی گئی ہیں۔

چونکہ علمی عملی صلاحیتوں کا متفاوت اور مختلف ہونا ایک امر فطری ہے اور تحصیل معاش بھی انھیں صلاحیتوں کے تابع ہے اس لئے مال و دولت کی ملکیت کا متفاوت ہونا بھی عین تقاضائے حکمت ہے جس کو دُنیا کا کچھ بھی عقل و شعور ہے وہ اس کا انکار نہیں کرسکتا۔

البتہ یورپ کی ظالمانہ سرمایہ داری اور اس کے مظالم سے عاجز آکر تقریباً اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے کچھ لوگوں نے معاشی مساوات کا نعرہ لگایا تھا اور امیر و غریب کی تفریق مٹانے کا دعویٰ لے کر اُٹھے تھے اور اس مساوات کی خیالی جنت کے شوق میں بہت سے غریب عوام اور مزدور اس تحریک کے علمبردار بھی ہو گئے تھے مگر چند قدم بھی چلنے نہ پائے تھے کہ ان کو اس لغو منصوبہ کی ناکامی اور رسوائی واضح ہوگئی۔ پہلے ہی تین سال کے تجربہ نے معاشی مساوات کے ناقابلِ عمل ہونے کو واضح کردیا اور ۱۹۳۱ء سے اُجرتوں کے فرق اور معاشی محرک کے اصول کو عملاً اختیار کرلیا گیا۔ لیکن پہلے دس سال میں کچھ شرم اور جھجک باقی تھی اس لئے مساوات کو اپنا مقصد بتلاتے رہے اگرچہ عمل اس کے خلاف ہوتا رہا۔ اور ۱۹۳۱ء سے اس کو بحیثیت اصول بھی ترک کرنیکا اعلان کردیا۔

سب سے پہلے اشتراکیت کے علمبرداروں میں سے اسٹالن نے یہ اعلان کیا کہ اشتراکیت مساوات کی علمبردار نہیں ہے۔ جو لوگ یہ نعرہ بلند کرتے ہیں مارکسزم (اشتراکیت) کے دشمن ہیں اس کے الفاظ اپنی کتاب مسائل لینن ازم میں یہ ہیں: "مارکزم مساوات پرستی کا دشمن ہے۔" ص ۵۰۲ مطبوعہ ماسکو۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد عملی طور پر مزدوریوں اور تنخواہوں میں بے پناہ تفاوت کا ظہور ہونے لگا۔ ایک اشتراکی مصنف ایم وائی یون نے ۱۹۳۶ء میں تنخواہوں کے فرق کی یہ کیفیت بیان کی تھی۔

عام مزدور کی تنخواہ ۱۱۰ روبل سے ۴۰۰ تک

درمیانہ افسر کی تنخواہ: ۳۰۰ سے ایک ہزار تک

اونچے افسر کی تنخواہ: ۱۵۰۰ روبل سے دس ہزار تک

چوٹی کے لوگ بیس ہزار روبل سے تیس ہزار روبل تک تنخواہ پاتے ہیں۔ (بحوالہ مخفی نام۔ ص ۱۳۱ء)۔

خروشیف نے ۵ مئی سن ۱۹۶۰ء کو سپریم سوویٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہم اجرتوں میں فرق مٹانے کی تحریک کے سختی سے مخالف ہیں۔ ہم اجرتوں میں مساوات قائم کرنے اور انکے ایک سطح پر لانے کے کھلے بندوں مخالف ہیں۔ یہ لینن کی تعلیم ہے۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ سوشلسٹ سماج میں مادّی محرکات کا پورا لحاظ رکھا جائیگا۔"

(سوویٹ ورلڈ۔ ص ۳۴۶)

معاشی مساوات کے خواب کی یہ تعبیر عدم مساوات تو ابتدا ہی پر سامنے آگئی تھی مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ عدم مساوات اور امیر و غریب کا تفاوت اشتراکی مملکت روس میں عام سرمایہ دار ملکوں سے آگے بڑھ گیا۔ رُوسی فوج میں ۱۹۴۳ء میں ایک سپاہی کو صرف ۱۰ روبل تنخواہ ملتی تھی جبکہ لفٹننٹ کو ایک ہزار روبل اور کرنل کو دو ہزار چار سو روبل ملتے تھے۔

(ہفت روزہ اکانمسٹ جولائی ۱۹۴۳ء)۔ اجرتوں میں فرق ایک اور تیس سے بڑھ کر ایک اور سو تک جا پہنچا (یہ سب حوالے ماہنامہ چراغ راہ سوشلزم نمبر سے ماخوذ ہیں)۔

لیون سیڈو لکھتا ہے: "شاید ہی کوئی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک ایسا ہو جہاں مزدوروں کی اجرتوں میں اتنا تفاوت ہو جتنا روس میں ہے۔"

واقعات کی ان چند مثالوں نے آیت مذکورہ واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق کی جبری تصدیق منکرین کی زبانوں سے کرادی واللہ یفعل ما یشاء! اس آیت کے تحت تو صرف اتنا ہی بیان کرنا تھا کہ رزق و مال میں تفاوت قدرتی اور فطری اور عین مصالح انسانی کے مطابق ہی باقی تقسیم دولت کے اسلامی اصول اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اسکا امتیاز انشاءاللہ تعالیٰ آیت سورہ نحن قسمنا بینھم معیشتھم کے تحت میں آئیگا اور اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل رسالہ "اسلام کا نظام تقسیم دولت" کے نام سے شائع ہوچکا ہے، اسکا مطالعہ بھی کافی ہے۔

حضرت معاویہؓ اور خلافت وملوکیت

محمد تقی عثمانی

حضرت علیؓ پر سبّ وشتم:

مولانا مودودی صاحب نے "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت حضرت معاویہؓ پر چوتھا اعتراض یہ کیا ہے کہ:

"ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجد نبویؐ میں منبر رسولؐ پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے، کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا۔ اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے آکر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبۂ جمعہ میں سبِّ علیؓ کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کردی: إن الله يأمر بالعدل والإحسان الخ (ص: ۱۷۴)

مولانا نے اس عبارت میں تین دعوے کئے ہیں، ایک یہ کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ پر خود سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، دوسرے یہ کہ ان کے تمام گورنر یہ حرکت کرتے تھے، تیسرے یہ کہ یہ گورنر حضرت معاویہؓ کے حکم سے ایسا کرتے تھے۔ اب ان تینوں دعووں کا ان کے اصل ماخذ میں مطالعہ کیجئے:

جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے سو حضرت معاویہؓ کی طرف اس "مکروہ بدعت" کو منسوب کرنے کے لئے انہوں نے تین کتابوں کے پانچ حوالے پیش کئے ہیں (طبری جلد ۴ ص ۱۸۸، ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۳۴، ج ۴ ص ۱۵۴، البدایہ ج ۸ ص ۲۵۹، ج ۹ ص ۸۰) ہم نے ان میں سے ایک ایک حوالہ کو صرف مذکورہ صفحات ہی پر نہیں، بلکہ ان کے آس پاس بھی بنظر غائر دیکھا، ہمیں کسی بھی کتاب میں یہ کہیں نہیں ملا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ "خود" حضرت علیؓ پر برسرِ منبر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔ لیکن چونکہ مولانا نے تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ "وہ خود" (معاذ اللہ) اس "انسانی اخلاق کے خلاف" فعل کا

ارتکاب کرتے تھے۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ شاید مولانا نے ایسی کوئی روایت کسی اور مقام پر دیکھی ہو اور اس کا حوالہ دینا بھول گئے ہوں، چنانچہ ہم نے مذکورہ تمام کتابوں کے متوقع مقامات پر دیر تک جستجو کی کہ شاید کوئی گری پڑی روایت ایسی مل جائے لیکن یقین فرمائیے کہ ایسی کوئی بات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملی، پھر بعض ان تواریخ کی طرف بھی رجوع کیا جنکے بارے میں مولانا کو اعتراف ہے کہ ان کے مصنف شیعہ تھے۔ مثلاً مسعودی کی مروج الذہب، لیکن اس میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ملی۔

اس کے برعکس اس جستجو کے دوران ایسی متعدد روایات ہمیں ملیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ سے اختلاف کے باوجود ان کا کس قدر احترام کرتے تھے؟ ان میں سے چند روایات ملاحظہ فرمائیے:

(۱) حافظ ابن کثیرؒ نقل فرماتے ہیں:

لما جاء خبر قتل علیؓ إلی معاویۃ جعل یبکی، فقالت لہ امرأتہ أتبکیہ وقد قاتلتہ؟ فقال ویحک إنک لا تدرین ما فقد الناس من الفضل والفقہ والعلم[۱]

"جب حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کے قتل ہونے کی خبر ملی تو وہ رونے لگے ان کی اہلیہ نے ان سے کہا کہ آپ اب انکو روتے ہیں حالانکہ زندگی میں ان سے لڑ چکے ہیں؟ حضرت معاویہؓ نے فرمایا تمھیں پتہ نہیں کہ آج لوگ کتنے علم و فضل اور فقہ سے محروم ہو گئے۔"

یہاں حضرت معاویہؓ کی اہلیہ محترمہ نے یہ اعتراض تو کیا کہ اب آپ انھیں کیوں روتے ہیں جبکہ زندگی میں ان سے لڑتے رہے لیکن یہ نہیں کہا کہ زندگی میں تو آپ ان پر سب و شتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے اب ان پر کیوں روتے ہیں؟

(۲) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت بسر بن ارطاۃ رضؓ نے حضرت معاویہؓ اور حضرت زید بن عمر بن خطابؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ کو کچھ برا بھلا کہا حضرت معاویہؓ نے اس پر انھیں توبیخ کرتے ہوئے فرمایا:

"لتشتم علیاً وھو جدہ"

"تم علیؓ کو گالی دیتے ہو حالانکہ وہ ان کے دادا ہیں؟"[۲]

(۳) علامہ ابن اثیر جزریؒ نے حضرت معاویہؓ کا جو آخری خطبہ نقل کیا ہے، اس میں ان کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ:

لن یأتیکم من بعدی إلا من أنا خیر منہ کما أن من قبلی کان خیرا منی[۳]

میرے بعد تمھارے پاس (جو خلیفہ) بھی آئے گا، میں اس سے بہتر ہوں گا، جسطرح مجھ سے پہلے جتنے (خلفاء) تھے، مجھ سے بہتر تھے۔

(۴) علامہ ابن عبد البرؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے بڑے اصرار کے ساتھ ضرار صدائی سے کہا کہ "میرے سامنے علیؓ کے اوصاف بیان کرو" ضرار صدائی نے بڑے بلیغ الفاظ میں حضرت علیؓ کی غیر معمولی تعریفیں کیں، حضرت معاویہؓ سنتے رہے اور آخر میں رو پڑے، پھر فرمایا:

رحم اللہ أبا الحسن، کان واللہ کذلک۔

اللہ ابو الحسن (علیؓ) پر رحم کرے، خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے۔[۴]

نیز حافظ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ مختلف

---

[۱] البدایۃ والنہایہ ص ۱۳۰ ج ۸۔ [۲] الطبری ص ۲۴۸ ج ۴ مطبعۃ الاستقامہ بالقاہرۃ ۱۳۵۸ھ والکامل لابن الاثیر ص ۵ ج ۴
[۳] الکامل لابن الاثیر ص ۲ ج ۴۔ [۴] الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۴۳ و ۴۴ ج ۳۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، القاہرہ ۱۹۳۹ء

فقہی مسائل میں حضرت علیؓ سے خط و کتابت کے ذریعہ معلومات حاصل کیا کرتے تھے چنانچہ جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ:

ذھب الفقه والعلم بموت ابن ابی طالب رض۔

ابن ابی طالبؓ کی موت سے فقہ اور علم رخصت ہوگئے۔" [1]

غرض اس جستجو کے دوران ہمیں اس قسم کی تو کئی روایتیں ملیں، لیکن کوئی ایک روایت بھی ایسی نہ مل سکی جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (معاذ اللہ) خطبوں میں حضرت علیؓ پر سبّ و شتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے خدا ہی جانتا ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر یہ الزام کس بنیاد پر کس دل سے عائد کیا ہے؟

پھر دوسرا دعویٰ مولانا نے یہ کیا ہے کہ "ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علیؓ پر سبّ و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔"

ظاہر ہے کہ مولانا کا یہ دعویٰ اس وقت تو ثابت ہو سکتا ہے جب وہ حضرت معاویہؓ کے "تمام گورنروں" کی ایک فہرست جمع فرما کر ہر ایک گورنر کے بارے میں یہ ثابت فرمائیں کہ ان میں سے ہر ایک نے انفرادی یا اجتماعی طور پر (معاذ اللہ) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالیاں دی تھیں، نیز اس بات کا بھی ثبوت ان کے پاس ہو کہ ان میں سے ہر ایک کو انفرادی یا اجتماعی طور پر حضرت معاویہؓ نے یہ حکم دیا تھا کہ حضرت علیؓ پر "سبّ و شتم کی بوچھاڑ" کیا کرو۔

لیکن اپنے اس الزام کی تائید میں جو حوالے مولانا نے پیش کئے ہیں ہم نے ان کی طرف رجوع کیا تو ان میں سے ایک بات بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکی۔ اول تو یہ سمجھ لیجئے کہ مولانا کے دیئے ہوئے پانچ حوالوں میں حضرت معاویہؓ کے صرف دو گورنروں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت کیا کرتے تھے ایک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، دوسرے مروان بن الحکم [2] اگر ان روایات کو تھوڑی دیر کے لئے درست مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ حضرت معاویہؓ کے دو گورنروں پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو برا بھلا کہا کرتے تھے۔ اس سے آخر یہ کیسے لازم آگیا کہ حضرت معاویہؓ کے "تمام گورنر" خود حضرت معاویہؓ کے حکم سے ایسا کیا کرتے تھے۔ "یہ تمام گورنر" کا الزام تو ایسا ہے کہ اسے شاید کسی موضوع روایتوں کے مجموعے سے بھی ثابت نہ کیا جا سکے۔

اس کے بعد اب ان دو روایتوں کی حقیقت بھی سن لیجئے جن میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور مروان بن الحکم کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) حضرت علیؓ پر سبّ و شتم کیا کرتے تھے۔

پہلی روایت اصلاً علامہ ابن جریر طبریؒ نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کی ہے اور انہیں سے ذکر کر کے ابن اثیر جزریؒ نے اپنی تاریخ الکامل میں اسے درج کر دیا ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قال هشام بن محمد عن أبی مخنف عن المجالد بن سعید والصقعب بن زهیر وفضیل بن خدیج والحسین بن عقبة المرادی قال کل قد حدثنی بعض هذا الحدیث فاجتمع حدیثهم فیما سُقتُ من حدیث حجر بن عدی الکندی وأصحابه أن معاویة بن ابی سفیان لما ولی المغیرة بن شعبة فی جمادی سنة ٤١ دعاه فحمد الله واثنی علیه ثم قال أما بعد ..... وقد أردت ایصاءک بأشیاء کثیرة فأنا تارکها اعتماداً علی بصرک بما یرضینی ویسعد سلطانی ویصلح به رعیتی ولست تارکاً ایصاءک

[1] الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۴۵ ج ۳، ذکر سیدنا علیؓ بن ابی طالب [2] طبری ج ۴ ص ۱۸۸ اور کامل ابن اثیر ص ۲۳۴ ج ۳ کا حوالہ مولانا نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے متعلق دیا ہے اور البدایہ ص ۲۵۹ ج ۸ کا حوالہ مروان بن الحکم سے متعلق ہے رہ گیا البدایہ ص ۸۰ ج ۹ کا حوالہ سو اس میں حجاج بن یوسف کے بھائی محمد بن یوسف الثقفی کا ذکر ہے جو حضرت معاویہؓ کا نہیں بلکہ ان کے بہت بعد ولید بن عبدالملک کا گورنر تھا، اسی طرح ابن اثیر ص ۴۲ ج ۵ ا ۵ میں بنو امیہ کے خلفاء کا عمومی تذکرہ ہے حضرت معاویہؓ یا ان کے کسی گورنر کا نہیں۔

بخصلة لا تتحم عن شتم علیؓ وذمه والترحم علی عثمان والاستغفار له والعیب علی أصحاب علیؓ والاقصاء لهم وترک الاستماع منهم ....

....

قال ابو مخنف قال الصقعب بن زهیر سمعت الشعبی یقول ... وأقام المغیرة علی الکوفة عاملا لمعاویة سبع سنین وأشهراً وهو من أحسن شیئ سیرة وأشده حبا للعافیة غیر أنه لایدع ذم علی والوقوع فیه "[1]

"ہشام بن محمد نے ابو مخنف سے، اور انھوں نے مجالد بن سعید، صقعب ابن زہیر، فضیل بن خدیج اور حسین بن عقبۃ مرادی سے روایت کیا ہے کہ ابو مخنف کہتے ہیں کہ ان چاروں نے مجھے آئندہ واقعہ کے تھوڑے تھوڑے ٹکڑے سنائے، لہٰذا حجر بن عدی کندی کا جو واقعہ میں آگے سنا رہا ہوں اس میں ان چاروں کی مختلف روایتیں جمع ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ماہ جمادی ۴۱ھ میں معاویہ بن ابی سفیانؓ نے کوفہ پر مغیرہ بن شعبہؓ کو گورنر بنایا تو انھیں بُلا کر پہلے اللہ کی حمد و ثنا کی، پھر کہا کہ ..... میرا ارادہ تھا کہ میں تمھیں بہت سی چیزوں کی نصیحت کروں، لیکن چونکہ مجھے اعتماد ہے کہ تم مجھے راضی رکھنے، میری سلطنت کو کامیاب بنانے اور میری رعایا کی اصلاح کرنے پر پوری نظر رکھتے ہو، اسلئے میں ان تمام باتوں کو چھوڑتا ہوں۔ البتہ تمھیں ایک نصیحت کرنا میں ترک نہیں کرسکتا وہ یہ کہ علیؓ کی مذمت کرنے اور انھیں گالی دینے سے پرہیز نہ کرنا، عثمانؓ پر رحمت بھیجتے رہنا اور ان کے لئے استغفار کرتے رہنا، علیؓ کے اصحاب پر عیب لگانا، انھیں دور رکھنا اور ان کی بات نہ سننا، عثمانؓ کے اصحاب کی خوب تعریف کرنا، انھیں قریب رکھنا اور انکی باتیں سنا کرنا۔ ...... ابو مخنف کہتا ہے کہ صقعب بن زہیر نے کہا کہ میں نے شعبی کو کہتے ہوئے سنا کہ ..... مغیرہؓ کوفہ میں معاویہؓ کے عامل کی حیثیت سے سات سال اور کچھ مہینے رہے وہ بہترین سیرت کے مالک تھے اور عافیت کو تمام لوگوں سے زیادہ پسند کرتے تھے، البتہ وہ علیؓ کی مذمت اور انھیں بُرا بھلا کہنا نہیں چھوڑتے تھے"

یہ ہے وہ روایت جو مولانا کے مذکورہ بیان کی اصل الاصول ہے۔ اور جسے دیکھ کر مولانا نے صرف حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر نہیں بلکہ خود حضرت معاویہؓ اور ان کے تمام گورنروں پر بلا استثنا دالزام لگا دیا ہے کہ وہ برسر منبر" حضرت علیؓ پر سب وشتم کیا کرتے تھے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو خود اسی روایت میں آگے چل کر صاف لکھا ہوا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ حضرت علیؓ کی مذمت کس طرح کیا کرتے تھے؟ ٹھیک اسی صفحہ پر جس پر مخنف کے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ: "وہ حضرت علیؓ کی مذمت اور انھیں بُرا بھلا کہنا نہیں چھوڑتے تھے" آگے یہ الفاظ بھی ہیں کہ:

"قام المغیرة فقال فی علیؓ وعثمان کما کان یقول وکانت مقالته اللهم ارحم عثمان بن عفان وتجاوز عنه واجزه

[1] الطبری۔ ص ۱۸۷ و ۱۸۸ ج ۴

بأحسن عمله فإنه عمل بكتابك واتبع سنة نبيك صلى الله عليه وسلم وجمع كلمتنا وحقن دماءنا وقتل مظلوما اللهم فارحم أنصاره وأولياءه ومحبيه والطالبين بدمه ويدعو على قتلته"۔ [1]

"حضرت مغیرہؓ کھڑے ہوئے اور حضرت علیؓ اور عثمانؓ کے بارے میں جو کچھ کہا کرتے تھے وہی کہا۔ انکے الفاظ یہ تھے کہ یا اللہ عثمانؓ بن عفان پر رحم فرما اور ان سے درگذر فرما اور ان کے بہترین عمل کی انھیں جزا دے کیونکہ انھوں نے تیری کتاب پر عمل کیا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی اور ہماری بات ایک کردی، اور ہمارے خون کو بچایا اور مظلوم ہو کر قتل ہوگئے، یا اللہ ان کے مددگاروں، دوستوں، محبت کرنے والوں اور ان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں پر رحم فرما، اور وہ ان کے قاتلوں کے لئے بد دعا کرتے تھے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت حضرت مغیرہؓ حضرت علیؓ کی ذات پر کوئی شتم نہیں فرماتے تھے، بلکہ وہ قاتلین عثمانؓ کے لئے بد دعا کیا کرتے تھے۔ جسے شیعہ راویوں نے حضرت علیؓ پر لعن طعن سے تعبیر کردیا۔ ظاہر ہے کہ جب راوی حضرت مغیرہؓ کے الفاظ صراحتاً نقل کر رہے ہیں تو فیصلہ ان الفاظ پر کیا جائے گا نہ کہ اس تاثر پر جو ان الفاظ سے راویوں نے لیا۔ یا اس تعبیر پر جو روایت بالمعنیٰ (INDIRECT NARRATION) میں انھوں نے اختیار کی۔

پھر دوسری اہم ترین بات یہ ہے کہ حافظ ابن جریرؒ نے یہ روایت جس سند کے ساتھ نقل کی ہے، وہ اوّل سے آخر تک شیعہ یا کذاب اور جھوٹے راویوں پر مشتمل ہے۔

اس روایت کا پہلا راوی ہشام بن الکلبی ہے جو مشہور راوی محمد بن السائب الکلبی کا بیٹا ہے، اس کے بارے میں ابن عساکرؒ کا قول ہے کہ:

"رافضي ليس بثقة"

وہ رافضی ہے، ثقہ نہیں [2]

اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن ابی طیؒ نے اسے امامیہ (شیعوں کا ایک فرقہ) میں شمار کیا ہے اور ابو یعقوب حربیؒ فرماتے ہیں کہ:

"راوية للمثالب غاية"

"انتہا درجے کی مثالب روایت کرتا ہے" [3]

پھر دوسرا راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہے، اس کے بارے میں حافظ ابن عدیؒ فرماتے ہیں:

"شيعي محترق صاحب اخبارهم" [4]

"جلا بھنا شیعہ ہے اور انہی کی روایات کا ذکر کرتا ہے"۔

تیسرا راوی مجالد بن سعید ہے، ان کے ضعیف ہونے پر تو تمام ائمہ حدیث کا اتفاق ہے ہی، یہاں تک کہ تاریخی روایات میں بھی انھیں ضعیف مانا گیا ہے۔ امام یحییٰ بن سعید قطانؒ کے کوئی دوست کہیں جارہے تھے، انھوں نے پوچھا: "کہاں جا رہے ہو؟"۔ انھوں نے کہا "وہب بن جریر کے پاس جا رہا ہوں، وہ سیرت کی کچھ کتابیں اپنے باپ سے بواسطہ مجالد سناتے ہیں"۔ یحییٰ بن سعید نے فرمایا "تم بہت جھوٹ لکھ کر لاؤ گے"۔ [5]

اس کے علاوہ اشجؒ کا قول ہے کہ "یہ شیعہ تھے" [6]

چوتھے راوی فضیل بن خدیج ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابو حاتم کا قول ہے کہ فضیل بن خدیج اشتر کے غلام سے روایت کرتا ہے، مجہول ہے، اور جو راوی اس سے روایت کرتا ہے وہ متروک

[1] الطبری۔ ص: ۱۸۸، س ۲۱۔ ج ۴ [2] لسان المیزان ص ۱۶۹ ج ۶ دائرۃ المعارف ۱۳۳۰ھ [3] ایضاً ص ۱۹۷ ج ۶ [4] ایضاً ص ۹۲ م ج ۴ [5] و [6] ابو حاتم الرازیؒ۔ کتاب الجرح والتعدیل ص ۳۶۱ ج ۴ قسم اوّل، دائرۃ المعارف دکن ۱۳۶۲ھ و تہذیب التہذیب۔ ایضاً ص ۴۰۔ ج ۱۰ ایضاً ۱۳۲۶ھ

ہے[1] ان کے علاوہ دو راوی جن کا ذکر ابو مخنف نے کیا ہے، یعنی صقعب بن زہیر اور فضیل بن خدیج، وہ تو سرے سے مجہول ہی ہیں[2]

اب آپ غور فرمایئے کہ جس روایت کے تمام راوی از اوّل تا آخر شیعہ ہوں، اور ان میں سے بعض نے مقصد ہی یہ بنا رکھا ہو کہ صحابۂ کرامؓ کی طرف بُری بھلی باتیں منسوب کریں۔ کیا ایسی روایت کے ذریعہ حضرت معاویہؓ یا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے خلاف کوئی الزام عائد کرنا سراسر ظلم نہ ہوگا؟ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ:

میں نے قاضی ابوبکر ابن العربیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ کی کتابوں پر اعتماد کرنے کے بجائے خود تحقیق کرکے آزادانہ رائے قائم کرنیکا راستہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی کتابیں شیعوں کے رد میں لکھی ہیں لہٰذا ان کی حیثیت "وکیل صفائی" کی سی ہوگئی ہے[3]

اب مولانا مودودی صاحب خود ہی۔ انصاف فرمائیں کہ کیا یہ غیر جانبداری کا تقاضہ ہے کہ "وکیل صفائی" کی بات تو سنی ہی نہ جائے، خواہ وہ کتنی ہی ثقہ، قابلِ اعتماد اور قابلِ احترام شخصیت ہو، اور دوسری طرف "مدعی" کی بات کو بے چون وچرا تسلیم کرلیا جائے، خواہ وہ کتنا ہی جھوٹا اور افترا پرداز ہو؟ قاضی ابوبکر بن عربیؒ اور ابن تیمیہؒ (معاذاللہ) حضرت علیؓ کے دشمن نہیں، صرف حضرت معاویہؓ کے ثقہ دوست ہیں۔ دوسری طرف ہشام بن الکلبی اور ابو مخنف حضرت معاویہؓ کے کھلے دشمن ہیں۔ اور ان کی افترا پردازی ناقابلِ انکار دلائل کے ساتھ ثابت ہے، یہ آخر غیر جانبداری کا کونسا تقاضا ہے کہ پہلے فریق کی روایات سے صرف ان کے "حُبِّ معاویہؓ" کی وجہ سے یکسر پرہیز کیا جائے اور دوسرے فریق کی روایات پر ان کے "بغضِ معاویہؓ" کے باوجود کوئی تنقید ہی نہ کی جائے؟

مولانا مودودی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"بعض حضرات تاریخی روایات کو جانچنے کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں راویوں کو ائمہ رجال نے مجروح قرار دیا ہے ..... یہ باتیں کرتے وقت یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ محدثین نے روایات کی جانچ پڑتال کے یہ طریقے دراصل احکامی احادیث کے لئے اختیار کئے ہیں ..... الخ

پھر آگے لکھتے ہیں:

"اس لئے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ابن سعد، ابن عبدالبرؒ، ابن کثیر، ابن جریر ابن حجر اور ان جیسے دوسرے ثقہ علماء نے اپنی کتابوں میں جو حالات مجروح راویوں سے نقل کئے ہیں انھیں رد کردیا جائے الخ۔ (ص ۳۱۷ تا ۳۱۹)

یہاں سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاریخی روایات میں سند کی جانچ پڑتال کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور جو روایتیں ان مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کردی ہیں، انھیں بس آنکھ بند کرکے قبول ہی کرلینا چاہیئے، تو آخر ان حضرات نے تقریباً ہر روایت کے شروع میں سند کو نقل کرنیکی زحمت ہی کیوں اٹھائی؟ کیا اس طرزِ عمل کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روایات کی صحت وسقم کی ذمہ داری اپنے قارئین اور محققین پر ڈال رہے ہیں کہ مواد ہم نے جمع کردیا، اب یہ تمھارا فرض ہے کہ اسے تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر پرکھو اور اہم نتائج اخذ کرنے کے لئے صرف ان روایات پر بھروسہ کرو جو تحقیق وتنقید کے معیار پر پوری اترتی ہوں۔

---

[1] میزان الاعتدال ص ۴۳۴ ج ۲ ولسان المیزان ص ۴۵۳ ج ۴

[2] صقعب بن زہیر کو اگرچہ امام ابو زرعہؒ نے ثقہ قرار دیا ہے مگر اس کے بارے میں ابو حاتم رازیؒ فرماتے ہیں شیخ لیس بمشھور (الجرح والتعدیل ص ۴۵۵ ج ۲ قسم ۱) اور فضیل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ھو مجھول راوی عنه رجل متروک الحدیث" (ص ۷۲، ج ۳ قسم ۱)

[3] خلافت وملوکیت

ورنہ اگر تاریخی روایات کے معاملے میں "اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جانے" کی ممانعت کر دی جائے[1] تو خدارا مولانا مودودی صاحب یہ بتلائیں کہ ابن جریرؒ نے جو یہ نقل کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے (معاذ اللہ) اوریا کی بیوی سے زنا کیا تھا، اسے رد کر دینے کی آخر کیا وجہ ہے۔؟ نیز ابن جریرؒ نے جو اپنی تاریخ میں بے شمار متعارض احادیث نقل کی ہیں، ان میں ترجیح آخر کس بناء پر دی جا سکے گی؟

تطویل سے بچنے کے لئے ہم اس بحث کو یہاں چھوڑتے ہیں کہ حدیث اور تاریخ کے درمیان معیار صحت کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ ہم چونکہ یہاں خاص اس روایت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جس سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے برسر منبر حضرت علیؓ کی مذمت کیا کرتے تھے، اس لئے مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ روایت کیوں ناقابلِ قبول ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ اور حدیث کے فرق کو ملحوظ رکھنے کے باوجود مندرجۂ ذیل وجوہ کی بناء پر مولانا کو بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ روایت قطعی طور پر ناقابلِ اعتماد ہے:

(۱) اس کے راوی سارے کے سارے شیعہ ہیں، اور کسی روایت سے جو صرف شیعوں سے منقول ہو، حضرت معاویہؓ پر طعن کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

(۲) اس کے تمام راوی ضعیف یا مجہول ہیں، اور ایسی روایت تاریخ کے عام واقعات کے معاملے میں تو کسی درجہ میں شاید قابلِ قبول ہو سکتی ہو۔ لیکن اس کے ذریعہ کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہو سکتی جس سے کسی صحابی کی ذات مجروح ہوتی ہو[2]

(۳) یہ روایت درایت کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی، اس لئے کہ اگر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ حضرت معاویہؓ کے حکم سے سات سال سے زائد مدت تک منبروں پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ پر "سب و شتم کی بوچھاڑ" کرتے رہو تو:

(الف) اس "سب و شتم" کی روایت کرنے والے تو بے شمار ہونے چاہئیں یہ صرف ایک شخص ہی اس کی روایت کیوں کر رہا ہے؟ اور ایک بھی وہ جو شیعہ ہے اور اس کا جھوٹا ہونا معروف ہے؟

(ب) کیا پوری امتِ اسلامیہ اپنے "خیر القرون" میں ایسے اہل جرأت اور اہلِ انصاف سے قطعی طور پر خالی ہو گئی تھی جو اس "مکروہ بدعت" سے حضرت معاویہؓ اور ان کے گورنروں کو روکتے، کیا حضرت حجر بن عدیؓ

---

[1] پھر یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ ابو مخنف کلبی اور ہشام جیسے لوگوں کے حالات دیکھنے کے لئے تو مولانا اسماء الرجال کی کتابیں کھولنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں اور دوسرے مورخین کو قابلِ اعتماد ثابت کرنے کے لئے ص ۳۰۹ سے ۳۲۰ تک وہ بلا تکلف اسماء الرجال ہی کے علماء اور کتابوں کے حوالے دیتے چلے گئے ہیں ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر رہے ہیں کہ کیا جرح و تعدیل صرف ان مورخین ہی کے بارے میں کی جا سکتی ہے جن کی کتابیں اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں اور ان سے اوپر کے مورخین کے حالات کی چھان بین نہیں کرنی چاہئے؟ یا اسماء الرجال کی کتابوں میں سے مورخین کی صرف تعدیل ہی نقل کی جا سکتی ہے اور "جرح" نقل کرنا ممنوع ہے؟ یا صرف ان مورخین کے حالات اسماء الرجال کی کتابوں میں دیکھنے چاہئیں جو ثقہ ہیں اور مجروح مورخین کے حالات کیلئے ان کتابوں کی طرف رجوع نہ کرنا چاہئے؟ ان میں سے کون سی بات ہے جسے صحیح کہا جائے؟

[2] مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے: "بعض حضرات اس معاملہ میں یہ نرالا قاعدۂ کلیہ پیش کرتے ہیں کہ ہم صحابہ کرامؓ کے بارے میں صرف وہی روایات قبول کریں گے جو ان کی شان کے مطابق ہو اور ہر اس بات کو رد کر دیں گے جس سے ان پر حرف آتا ہو خواہ وہ کسی صحیح حدیث ہی میں وارد ہوئی ہو۔" (ص ۳۰۵) ہمیں معلوم نہیں کہ مولانا کے معترضین میں سے کسی نے یہ "قاعدۂ کلیہ" بیان کیا بھی ہے یا نہیں، بہرحال ہم اس قاعدۂ کلیہ کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ درست مانتے ہیں۔ ہماری نظر میں قاعدہ یہ ہے کہ "ہر اس ضعیف روایت کو رد کر دیا جائیگا جس سے کسی صحابی کی ذات مجروح ہوتی ہو، خواہ وہ روایت تاریخ کی ہو یا حدیث کی" ہمارا خیال ہے کہ مولانا کو اس "قاعدۂ کلیہ" پر کوئی اشکال نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ بقول حضرت شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلویؒ صحابہؓ کی عدالت قرآن، سنت متواترہ اور اجماع سے ثابت ہے اور اسکے خلاف کوئی بات ضعیف روایات کے بل پر ثابت نہیں کی جا سکتی۔

کے علاوہ کوئی باغیرت مسلمان کوفہ میں موجود نہیں تھا؟

(ج) عدالت و دیانت کا معاملہ تو بہت بلند ہے حضرت معاویہؓ کے عقل و تدبر اور سیاسی بصیرت سے تو ان کے دشمنوں کو بھی انکار نہیں ہوگا، کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان جیسا صاحبِ فراست انسان محض بغض کے جذبات میں بہہ کر ایک ایسا بے فائدہ اقدام کرے جو اس کی حکومت کے استحکام کے لئے خطرہ بن سکتا ہو؟ کوفہ حضرت علیؓ کے معتقدین کا مرکز تھا۔ کیا حضرت معاویہؓ ان کے سامنے حضرت علیؓ پر سب وشتم کروا کر یہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد بھی اہل کوفہ سے برابر لڑائی ٹھنی رہے اور وہ کبھی دل سے حضرت معاویہؓ کے ساتھ نہ ہوں؟ کوئی گھٹیا سے گھٹیا سیاست داں بھی کبھی یہ نہیں کر سکتا کہ اپنے مخالف قائد کے مرنے کے بعد اس قائد کے معتقدین کے گڑھ میں بلا وجہ اُسے گالیاں دیا کرے۔ ایسا کام وہی شخص کر سکتا ہے جسے لوگوں کو خواہ مخواہ اپنی حکومت کے خلاف بھڑکانے کا شوق ہو۔[1]

ان وجوہ کی بنا پر یہ روایت تو قطعی طور پر ناقابلِ قبول ہے۔ دوسری روایت جس کا حوالہ مولانا نے دیا ہے "البدایۃ والنہایۃ" کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

"لما كان (مروان) متوليا على المدينة لمعاوية كان يسب عليًا كل جمعة على المنبر، وقال له الحسن بن علي: لقد لعن الله أباك الحكم وأنت في صلبه على لسان نبيه فقال: لعن الله الحكم وما ولد والله أعلم"

"جب مروان مدینہ منورہ میں حضرت معاویہؓ کا گورنر تھا، اس وقت وہ ہر جمعہ کو منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ پر سب وشتم کیا کرتا تھا، اور اس سے حضرت حسن بن علیؓ نے فرمایا کہ: تیرے باپ حکم پر اللہ نے اپنے نبیؐ کی زبان سے اس وقت لعنت کی تھی جب تو اس کی صلب میں تھا، اور یہ کہا تھا کہ حکم اور اسکی اولاد پر خدا کی لعنت ہو۔"[2]

اگرچہ یہ روایت کئی وجہ سے مشکوک ہے[3]، لیکن اتنی بات کچھ اور روایتوں سے بھی مجموعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مروان بن الحکم مدینہ منورہ کی گورنری کے دوران حضرت علیؓ کی شان میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا جو حضرت علیؓ کے محبوب رکھنے والوں کو ناگوار گذرتے تھے لیکن یہ نازیبا الفاظ کیا تھے؟ ان تاریخی روایتوں میں سے کسی میں ان کا ذکر نہیں البتہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ایک واقعہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ:

"ان رجلا جاء الى سهل بن سعد فقال هذا فلان لأمير المدينة يدعو عليا عند المنبر قال فيقول ما ذا قال يقول له أبو تراب فضحك وقال والله ما سماه الا النبي صلى الله عليه وسلم وما كان له اسم أحب إليه منه"

"ایک شخص حضرت سہلؓ کے پاس آیا اور بولا کہ فلاں امیر مدینہ منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ کو سب وشتم کرتا ہے، حضرت سہلؓ نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا کہ انھیں

---

[1] جناب مولانا مودودی صاحب تو اس قسم کے درایتی قرائن کی بنا پر بالکل صحیح الاسناد احادیث کو بھی رد کر دینے کے قائل ہیں، چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کو صحیح الاسناد ماننے کے باوجود مولانا نے اس لئے رد کر دیا ہے کہ وہ درایت کے اس جیسے قرائن کے خلاف ہے، حالانکہ وہ حدیث بھی کوئی "احکامی حدیث" نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی واقعہ ہی ہے کیا اس موقع پر وہ درایت کے ان قرائن کی بنا پر ایک سراسر ضعیف روایت کو رد نہیں فرمائیں گے؟

[2] البدایۃ والنہایۃ ص ۲۵۹ ج ۸

[3] اول تو اسلئے کہ یہ پوری عبارت البدایۃ والنہایۃ کے اصل مصری نسخے میں موجود نہیں ہے، دوسرے اسلئے کہ اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ مروان کا انتقال طائف میں ہوا تھا، حالانکہ اسکی وفات مدینہ یا دمشق میں ہوئی ہے، تیسرے اسلئے کہ اس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو الفاظ منسوب کئے گئے ہیں وہ بہت مشکوک ہیں۔

"ابو تراب" کہتا ہے، حضرت سہلؓ ہنس پڑے
اور فرمایا: خدا کی قسم اس نام سے تو خود آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پکارا ہے اور آپ
کے نزدیک ان کا اس سے پیارا نام کوئی نہ تھا۔"[1]

اگر یہاں "امیر مدینہ" سے مراد مروان ہی ہے، جیسا کہ ظاہر یہی ہے تو اس "سب وشتم" کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ابو تراب کے معنیٰ ہیں "مٹی کا باپ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو محبت میں اس نام سے پکارا کرتے تھے، مروان زیادہ سے زیادہ اسے اس کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہوگا۔

اگر فرض کیجئے کہ مروان اس سے بھی زیادہ کچھ نازیبا الفاظ حضرت علیؓ کی شان میں استعمال کرتا تھا تو آخر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ یہ کام حضرت معاویہؓ کے حکم سے کرتا تھا مولانا نے البدایہ کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے، اس میں بھی کہیں یہ مذکور نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے اسے اس کام کا حکم دیا تھا۔ یا وہ اس کے اس فعل پر راضی تھے، ایسی صورت میں یہ الفاظ لکھنے کا کوئی جواز ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت معاویہؓ:

"خود، اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر
خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ
پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔"

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ:

(۱) خود حضرت معاویہؓ کی طرف سب وشتم کی جو نسبت مولانا نے کی ہے، اس کا تو کوئی ادنیٰ ثبوت بھی مولانا کے بیان کردہ حوالوں میں، بلکہ کہیں نہیں ہے اور اس کے برعکس حضرت معاویہؓ سے حضرت علیؓ کی تعریف وتوصیف کے جملے منقول ہیں۔

(۲) اسی طرح تمام گورنر کا جو لفظ مولانا نے استعمال کیا ہے وہ بھی بالکل بلا دلیل ہے۔ مولانا کے بیان کردہ حوالوں میں صرف دو گورنروں کا ذکر ہے۔

(۳) ان دو گورنروں میں سے ایک یعنی مروان بن الحکم کے بارے میں مولانا کے دئے ہوئے حوالے کے اندر، یا اور کہیں یہ بات موجود نہیں ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے حضرت علیؓ پر سب وشتم کیا کرتا تھا۔

(۴) سب وشتم کی بوچھاڑ کا لفظ بھی بلا دلیل ہے، اس لئے کہ مولانا کے دئے ہوئے حوالے میں تو سب وشتم کے الفاظ منقول نہیں۔ صحیح بخاری کی روایت سے جو الفاظ معلوم ہوتے ہیں انھیں "سب وشتم" کھینچ تان کر ہی کہا جا سکتا ہے۔

(۵) دوسرے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں مولانا نے حوالہ صحیح دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس میں یہ تصریح ہے کہ وہ قاتلین عثمانؓ کے لئے بددعا کیا کرتے تھے۔ دوسرے یہ روایت از اوّل تا آخر سارے کے سارے شیعہ راویوں سے مروی ہے اور روایت و درایت ہر اعتبار سے واجب الرّد ہے۔

استلحاق زیاد:

"قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر پانچواں اعتراض یہ کیا ہے کہ:

"زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے
ان افعال میں سے ہے جنمیں انھوں نے سیاسی
اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے
کی خلاف ورزی کی تھی، زیاد، طائف کی ایک
لونڈی سمیہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا،
لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں حضرت
معاویہؓ کے والد جناب ابوسفیانؓ نے اس
لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ اور اسی سے
وہ حاملہ ہوئی، حضرت ابوسفیانؓ نے خود بھی
ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب، باب مناقب علیؓ ص ۵۲۵ جلد اوّل، اصح المطابع کراچی۔

انہی کے نطفہ سے ہے، جوان ہو کر یہ شخص اعلیٰ درجے کا مدبر، منتظم، فوجی لیڈر اور غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ثابت ہوا، حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں ان کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والدِ ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد انہی کا وَلد الحرام ہے پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا، یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے، وہ تو ظاہر ہی ہے، مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ: "بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں"۔ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ نے اسی وجہ سے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس سے پردہ فرمایا۔" (ص ۱۷۵)

مولانا نے جس افسوسناک انداز سے یہ واقعہ نقل فرمایا ہے اس پر کوئی تبصرہ سوائے اس کے نہیں کیا جا سکتا کہ اصل تواریخ کی عبارت نقل کر دی جائے۔ قارئین دونوں کا مقابلہ کر کے خود جو چاہیں فیصلہ فرمائیں۔

مولانا نے اس واقعے کے لئے چار کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔ (الاستیعاب ج ۱، ص ۱۹۶، ابن الاثیر ج ۳ ص ۲۲۰ و ۲۲۱، البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۸ اور ابن خلدون ج ۳ ص ۷ و ۸) ان میں سے البدایہ والنہایہ میں تو اس واقعے کے سلسلے میں کل سات ہی سطریں لکھی ہیں جن سے واقعہ کی کوئی تفصیل ہی معلوم نہیں ہوتی باقی تین کتابوں میں سے جس کتاب میں یہ واقعہ سب سے زیادہ مرتب طریقہ سے بیان کیا گیا ہے، وہ ابن خلدون کی تاریخ ہے جس کا حوالہ مولانا نے سب سے آخر میں دیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"سمیہ[1] جو زیاد کی ماں ہے حارث بن کلدہ طبیب کی لونڈی تھی، اسی کے پاس اس سے حضرت ابو بکرہؓ پیدا ہوئے پھر اس نے اس کی شادی اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے کر دی تھی، اور اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا (واقعہ یہ تھا کہ) ابو سفیان اپنے کسی کام سے طائف گئے ہوئے تھے، وہاں انہوں نے سمیہ سے اس طرح کا نکاح کیا جس طرح کے نکاح جاہلیت میں رائج تھے، اور اس سے مباشرت کی، اسی مباشرت سے زیاد پیدا ہوا اور سمیہ نے زیاد کو ابوسفیان سے منسوب کیا خود ابوسفیان نے بھی اس نسب کا اقرار کر لیا تھا مگر خفیہ طور پر۔"

آگے لکھتے ہیں: "جب حضرت علی[2] شہید ہو گئے اور زیاد نے

---

[1] "كانت سمية ام زياد مولاة للحارث بن كلدة الطبيب، وولدت عنده أبا بكرة ثم زوجها بمولىً له وولدت زيادًا وكان ابوسفيان قد ذهب إلى الطائف فى بعض حاجاته فأصابها بنوع من أنكحة الجاهلية. وولدت زيادًا هذا ونسبه إلى أبى سفيان وأقر لها به إلا انه كان مخفية" (تاریخ ابن خلدون ص ۱۴ ج ۳ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۶ء)

[2] "ولما قتل علىؓ وصالح زياد معاويةؓ وضع مُصْقَلَةَ بن هبيرةَ الشيبانى على معاوية ليعرض له بنسب أبى سُفيان ففعل، ورأى معاوية أن يستميله باستلحاقه فالتمس الشهادة بذلك ممن علم لحوق نسبه بأبى سُفيان فشهد له رجال من أهل البصرة والحقه، وكان أكثر شيعة علىؓ ينكرون ذلك وينقمونه على معاوية حتى أخوه أبو بكرة" (ابن خلدون ص ۱۵۔ ج ۳)

حضرت معاویہؓ سے صلح کرلی تو زیاد نے
مصقلہ بن ہبیرۃ شیبانی کو مامور کیا کہ وہ حضرت
معاویہؓ کو ابوسفیان کے نسب کے بارے
میں بتلائیں، اور حضرت معاویہؓ کی رائے
یہ ہوئی کہ اسے استلحاق کے ذریعہ مائل کریں
چنانچہ انھوں نے ایسے گواہ طلب کئے جو اس
بات سے واقف ہوں کہ زیاد کا نسب ابوسفیان
سے لاحق ہوچکا ہے، چنانچہ بصرہ کے باشندوں
میں سے کچھ لوگوں نے اس بات کی گواہی دی
اور اکثر شیعانِ علیؓ اس بات کو بُرا سمجھتے تھے
یہاں تک کہ ان کے بھائی حضرت ابوبکرہؓ بھی"

مولانا کا دوسرا ماخذ کامل ابنِ اثیر ہے۔ علامہ ابن اثیر جزریؒ نے شروع میں تو بس یہی لکھا ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ نے جاہلیت میں سمیہ سے مباشرت کی تھی، پھر اس مباشرت کے بارے میں بھی بڑی داستان طرازیاں نقل کی ہیں۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ:

اس کے علاوہ بھی بڑے قصوں نے رواج
پایا جن کے ذکر سے کتاب طویل ہوجائیگی
اس لئے ہم ان سے اعراض کرتے ہیں، اور
جو لوگ حضرت معاویہؓ کو معذور قرار
دیتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ
نے زیادؔ کا استلحاق اس لئے کیا تھا کہ
جاہلیت میں نکاح کی بہت سی قسمیں تھیں
ان سب قسموں کو ذکر کرنیکی تو ضرورت نہیں،

البتہ ان میں سے ایک قسم یہ تھی کہ کسی کسی
عورت سے بہت سے لوگ مباشرت کرتے
تھے، پھر جب وہ حاملہ ہوکر بچہ جنتی تو اس
بچے کو جس کی طرف چاہتی منسوب کردیتی
تو وہ اس کا بیٹا قرار پاجاتا، جب اسلام آیا
تو نکاح کا یہ طریقہ حرام ہوگیا، لیکن نکاح کے
جاہلی طریقوں میں سے جس طریقے سے بھی
کوئی بچہ کسی باپ کی طرف منسوب ہوا ہو اسلام
کے بعد بھی اس کو اس نسب پر برقرار رکھا گیا
اور ثبوتِ نسب کے معاملے میں کوئی تفریق
نہیں کی گئی۔"

ابن خلدونؒ اور ابن اثیرؒ کے ان بیانات سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ حضرت ابوسفیانؓ نے طائف میں سُمیہ سے زنا نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا نکاح کیا تھا۔ جو جاہلیت میں جائز سمجھا جاتا تھا اسلام نے اسے ممنوع تو کردیا مگر اس سے پیدا ہونے والی اولاد کو غیر ثابت النسب یا ولد الحرام قرار نہیں دیا۔ لیکن آگے چل کر ابن اثیر جزریؒ نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ:

" حضرت معاویہؓ یہ سمجھے کہ یہ استلحاق جائز ہے، اور
انھوں نے جاہلیت اور اسلام کے استلحاق میں
فرق نہیں کیا۔ اور یہ فعل ناقابل قبول ہے کیونکہ
اس فعل کے منکر ہونے پر مسلمانوں کا اتفاق
ہے۔ اور اسلام میں اس طرح کا استلحاق کسی
نے نہیں کیا کہ اُسے حجت قرار دیا جائے۔"

لہ وجرى أقاصيص يطول بذكرها الكتاب فأضربنا عنها ومن اعتذر لمعاوية قال انما استلحق معاوية زيادا لأن أنكحة الجاهلية كانت أنواعا لاحاجة إلى ذكر جميعها وكان منها أن الجماعة يجامعون البغي فاذا حملت وولدت ألحقت الولد بمن شاءت منهم فيلحقه فلما جاء الإسلام حرم هذا النكاح إلا أنه أقر كل ولد كان ينسب إلى أب من أي نكاح كان من أنكحتهم على نسبه ولم يفرق بين شيء منها۔ (کامل ابن اثیر، ص ۱۷۶ و ۱۷۷، ج ۳، طبع قدیم) اس کے بعد کی عبارت اور اس پر تبصرہ آگے آرہا ہے۔

لیکن واقعات کی مجموعی تحقیق کرنے سے ابن اثیر جزریؒ کا یہ اعتراض بھی بالکل ختم ہو جاتا ہے، صورتِ واقعہ یہ ہی کہ اگر حضرت ابوسفیانؓ نے جاہلی نوع کا ایک نکاح کرنے کے بعد زیاد کو اسلام سے قبل اپنا بیٹا قرار نہ دیا ہوتا، اور وہ خود اسلام کے بعد اسے اپنا بیٹا بنانا چاہتے تب تو یہ اعتراض درست ہوتا کہ حضرت معاویہؓ نے جاہلیت اور اسلام کے استحقاق میں فرق نہیں کیا، یہاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوسفیان نے زمانۂ جاہلیت ہی میں اپنے ساتھ زیاد کا استحاق کر لیا تھا۔ البتہ عام لوگوں کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ابن خلدون صاف لکھتے ہیں کہ:

"ولد زیادًا ونسبتہ إلی أبی سفیان واقرلها به الا أنه كان بخفية۔"[1]

سمیہ کے یہاں زیاد پیدا ہوا اور اس نے اسے ابوسفیانؓ سے منسوب کیا اور ابوسفیانؓ نے بھی اس نسب کا اقرار کیا، مگر خفیہ طور پر۔"

زیاد چونکہ حضرت ابوسفیان کے مسلمان ہونے سے پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا[2] اس لئے یہ استحاق یقیناً اسلام سے پہلے ہوا تھا۔ البتہ اس کا اظہار لوگوں پر نہیں ہوا تھا۔ جب حضرت معاویہؓ کے سامنے دس گواہوں نے (جن میں بعض جلیل القدر صحابہ بھی شامل تھے) اس بات کی گواہی دی کہ حضرت ابوسفیان نے اپنے ساتھ زیاد کے نسب کا اقرار کیا تھا۔ تب حضرت معاویہؓ نے ان کے لئے اس نسب کا اعلان کیا، مشہور محدث حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حضرت معاویہؓ نے ۴۴ھ میں ان (زیاد) کا استلحاق کیا، اور اس بات پر زیادؒ بن اسماء الحرمازی، مالکؓ بن ربیعہ سلولیؓ اور منذرؓ بن زبیر نے شہادت دی تھی، یہ بات مدائنیؒ نے اپنی مختلف سندوں سے روایت کی ہے اور گواہوں میں مندرجہ ذیل ناموں کا اضافہ کیا ہے، جویریہ بنتِ ابی سفیان، مسورؓ بن قدامہ الباہلی، ابنؓ ابی نصر الثقفی، زیدؓ بن نفیل الأزدی، شعبہؓ بن العلقم المازنی، بنو عمروؓ بن شیبان کا ایک شخص اور بنو المصطلق کا ایک شخص، ان سب نے ابوسفیانؓ کے بارے میں گواہی دی کہ زیاد ان کا بیٹا ہے البتہ منذر نے گواہی یہ دی تھی کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ابوسفیانؓ نے یہ بات کہی تھی، پھر حضرت معاویہؓ نے خطبہ دیا اور زیاد کا استحاق کر لیا پھر زیاد بولے، اور انھوں نے کہا کہ جو کچھ ان گواہوں نے کہا ہے اگر وہ حق ہے تو الحمد للہ! اور اگر یہ غلط ہے تو میں نے اپنے اور اللہ کے درمیان ان لوگوں کو ذمہ دار بنا دیا ہے۔"[3]

حافظ ابن حجرؒ نے دسویں گواہ کا نام نہیں لکھا، بلکہ بنو المصطلق کا ایک شخص" کہا ہے، ابوحنیفہ الدینوریؒ (متوفی ۲۸۲ھ) نے ان کا نام یزید لکھا ہے۔ اور ان کی گواہی اس طرح نقل کی ہے:

"انه سمع أبا سفيان يقول إن زيادًا من نطفة أقرها في رحم أمه سمية، فتم ادعاءه اياه"[4]

"میں نے ابوسفیانؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ زیاد اس نطفے سے ہے جو میں نے اس کی

---

[1] ابن خلدون ص ۱۴ ج ۳ [2] کیونکہ حضرت ابوسفیانؓ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے اور زیاد کی ولادت کے بارے میں چار قول ہیں: ہجرتؐ سے پہلے ہجرتؐ کے سال، غزوۂ بدر کے دن اور ٹھیک فتح مکہ کے سال (استیعاب ص ۵۴۸ ج ۱) [3] الاصابہ ص ۵۶۳ ج ۱، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ القاہرہ ۱۳۵۸ھ" زیاد بن ابیہ" [4] الدینوریؒ، الاخبار الطوال۔ ص ۲۱۹ تحقیق عبدالمنعم عامر، الادارۃ العامۃ للثقافۃ، القاہرہ ۱۹۶۰ء

ماں سُمیّہ کے رحم میں ڈالا تھا، لہٰذا یہ ثابت
ہوگیا کہ ابوسُفیانؓ نے زیادؔ کے حق میں اپنا
بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔"

جن گواہوں کے نام حافظ ابن حجرؒ نے علامہ مدائنیؒ کے حوالے سے لکھے ہیں، ان میں حضرت مالک بن ربیعہ سلولیؓ صحابہؓ میں سے ہیں اور بیعت رضوان میں شریک رہے ہیں[1]۔ ان حالات میں ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کا جو استلحاق دس گواہوں کی گواہی پر مجمع عام میں کیا، اس میں شریعت کے کونسے مسلمہ قاعدے کی خلاف ورزی ہوئی، جبکہ ابن اثیر جزریؒ کی تصریح کے مطابق جاہلی نکاح سے جاہلیت میں پیدا ہونے والی اولاد کو اسلام میں غیر ثابت النسب قرار نہیں دیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ :

"أما واللہ لقد علمت العرب
أنی کنت أعزھا فی الجاھلیۃ و
انّ الاسلام لم یزدنی إلّا عزّا
وانّی لم أتکثر بزیاد من قلۃ
ولم أتعزز بہ من ذلّۃ ولکن
عرفت حقا لہ فوضعتہ موضعہ[2]"

"خدا کی قسم! تمام عرب جانتے ہیں کہ جاہلیت
میں مجھے تمام عربوں سے زیادہ عزت حاصل تھی اور
اور ظاہر ہے کہ اسلام نے بھی میری عزت ہی میں
اضافہ کیا ہے، لہٰذا نہ تو ایسا ہے کہ میری نفری
قلیل ہو اور میں نے زیاد کے ذریعہ اس میں
اضافہ کر لیا ہو، اور نہ میں کبھی ذلیل تھا کہ
زیاد کی وجہ سے مجھے عزت مل گئی ہو بلکہ واقعہ
یہ ہے کہ میں نے اس کا حق سمجھا ہے اور اسے
اس کے حقدار تک پہنچا دیا ہے۔"

کیا مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں حضرت معاویہؓ کے اس حلفیہ بیان کے بعد (جسے مولانا مودودی نے یقیناً ابن اثیر اور ابن خلدونؒ کی تواریخ میں دیکھا ہوگا)، یہ کہنے کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے کہ :-

"زیاد بن سُمیّہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ
کے ان افعال میں سے ہے جن میں انھوں
نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے
ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی"

(ص: ۱۷۵)

یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی جو حضرات حضرت معاویہؓ کے اس فعل پر اعتراض کر رہے تھے، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ زیاد تو زنا سے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اس کا نسب حضرت ابوسفیانؓ سے لاحق نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بجائے ان کا اعتراض یہ تھا کہ حضرت ابوسفیانؓ نے سُمیّہ سے مباشرت ہی نہیں کی، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مخالفت کا بڑا شہرہ ہے لیکن کسی بندۂ خدا نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کی وجہ اعتراض کیا تھی؟ حافظ ابن عبد البرؒ نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے :

"لا واللہ ما علمتُ سُمیّۃ رأت
أبا سُفیان قطّ!"

"نہیں، خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں کہ سمیہ نے
کبھی ابوسفیانؓ کو دیکھا بھی ہے"[3]

اور عبد الرحمٰن بن الحکم نے اس موقع پر حضرت معاویہؓ کی ہجو میں جو شعر کہے تھے، ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے کہ ؎

واشھد أنھا حملت زیادًا
وصخرٌ من سُمیّۃ غیر دانٍ[4]

---

[1] الاصابہ ص ۵۲۴ ج ۳، [2] ابن الاثیر ص: ۲۱۷ ج ۳ طبع قدیم، الطبری ص ۱۶۳ ج ۴ مطبعۃ الاستقامۃ بالقاہرۃ ۱۳۵۸ھ و ابن خلدونؒ ص ۱۶ ج ۳ دار الکتاب اللبنانی، بیروت ۱۹۵۶ء تینوں نے یہ مقولہ نقل کیا ہے۔ البتہ ابن خلدونؒ نے صرف خط کشیدہ جملہ لکھا ہے اور اس میں "حق اللہ" کے الفاظ ہیں۔

[3] الاستیعاب تحت الاصابہ ص ۵۵۰ ج ۱ [4] ایضاً ص ۵۵۱ ج ۱

یعنی "میں گواہی دیتا ہوں کہ سمیہ کے بطن میں زیاد کا استقرارِ حمل اس حالت میں ہوا تھا کہ صخر (ابوسفیانؓ) سمیہ کے قریب بھی نہیں تھا۔"

اور ابن مفرغ نے کہا تھا ؎

شهدت بأن أمك لم تباشر
أبا سفيان واضعة القناع[۱]

"میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری ماں نے کبھی اوڑھنی اُتار کر ابوسفیانؓ کے ساتھ مباشرت ہی نہیں کی۔"

اور وہ ابنِ عامر جنھیں ایک خاص وجہ سے اس استلحاق کو ناجائز قرار دینے کی سب سے زیادہ خواہش تھی، انھوں نے بھی ایک شخص کے سامنے بس اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تھا کہ:

"لقد هممت أن آتي بقسامة من قريش يحلفون أن أبا سفيان لم ير سمية"

"میرا ارادہ ہے کہ میں قریش کے بہت سے قسم کھانے والوں کو لاؤں جو اس بات پر قسم کھائیں کہ ابوسفیانؓ نے کبھی سمیہ کو دیکھا تک نہیں[۲]۔"

سوال یہ ہے کہ یہ تمام معترضین اس بات کو ثابت کرنے پر کیوں زور لگا رہے تھے کہ حضرت ابوسفیانؓ کبھی سمیہ کے قریب تک نہیں گئے، انھوں نے سیدھی بات یہ کیوں نہیں کہی کہ ابوسفیانؓ اگر سمیہ کے قریب گئے بھی ہوں ـ تو یہ سراسر زنا تھا، اور زنا سے کوئی نسب ثابت نہیں ہوتا، یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ابوسفیانؓ نے سمیہ سے جاہلیت میں مبینہ مباشرت کی تھی تو پھر ان کو بھی زیاد کے استلحاق میں کوئی اعتراض نہیں تھا، ان کو اعتراض صرف یہ تھا کہ ان کے علم کے مطابق ابوسفیانؓ سمیہ کے قریب تک نہیں گئے۔ اس لئے زیاد کا استلحاق درست نہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ علم حضرت معاویہؓ پر حجت نہیں ہو سکتا، حضرت معاویہؓ کے پاس دس قابلِ اعتماد شہادتیں اثبات پر گذر چکی تھیں ان کے مقابلے میں دس لاکھ آدمی بھی نفی پر شہادت دیں تو شرعاً ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہم پر تو اس واقعہ کی تمام تفصیلات پڑھنے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جذبۂ احترامِ شریعت کا غیر معمولی تاثر قائم ہوا ہے۔ غور فرمائیے کہ حضرت معاویہؓ کی شرافت اور فضیلت کا معاملہ تو بہت بلند ہے ایک معمولی آدمی کے نفس کے لئے بھی یہ بات کس قدر ناگوار ہوتی ہے کہ جس شخص کو کل تک ساری دنیا ولد الحرام اور غیر ثابت النسب کہتی اور سمجھتی آئی تھی آج اُسے اپنا بھائی بنا لیا جائے، ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی، سردار اور سردار زادے کے لئے یہ بات کس قدر شاق ہوگی؟ لیکن جب دس گواہیوں کے بعد ایسے شخص کو اپنا بھائی قرار دینا "حق اللہ" بن جاتا ہے تو وہ اپنے تمام جذبات کو ختم کر کے اور مخالفین کی کھڑی کی ہوئی صعوبتوں کو جھیل کر پکار اُٹھتے ہیں کہ:

"عرفت حق الله فوضعته موضعه"

"میں نے اللہ کے حق کو پہچان لیا۔ اس لئے اسے اس کے حقدار تک پہنچا دیا۔"[۳]

یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے جن معترضین کو اصل واقعہ کا علم ہوتا گیا۔ انھوں نے اپنے اعتراضات سے رجوع کر لیا، حافظ ابن عبد البرؒ ہی نے نقل کیا ہے کہ عبد الرحمٰن بن الحکم اور ابن مفرغ جنھوں نے اس واقعہ پر حضرت معاویہؓ کے حق میں ہجویہ اشعار کہے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے مذکورہ بالا ارشاد کے

---

[۱] الاستیعاب۔ ص: ۵۵۲ ج ۱ [۲] الطبری ص ۱۶۳ ج ۴

[۳] ابن خلدون، ص ۱۶ ج ۳

بعد انھوں نے بھی اپنے سابقہ رویہ پر شرمندگی ظاہر کی[1] نیز ابن عامر جن کے بارے میں حافظ ابن جریرؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس استلحاق کی مخالفت کرنے کے لئے نفی پر گواہیاں جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا طبری ہی کی تصریح کے مطابق وہ بھی بعد میں حضرت معاویہؓ سے معافی مانگنے آئے تھے۔ اور حضرت معاویہؓ نے انھیں معاف کر دیا تھا[2]۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ بھی شروع میں اس استلحاق کے خلاف تھیں۔ ابن خلدونؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ زیاد نے حضرت عائشہؓ کو زیاد بن ابی سفیان کے نام سے خط لکھا، مقصد یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ بھی جواب میں "زیاد بن ابی سفیان" لکھ دیں گی تو اسے اپنے استلحاق نسب کی سند مل جائے گی۔ لیکن حضرت عائشہؓ نے جواب میں یہ الفاظ لکھے کہ:

"من عائشۃ ام المومنین الی ابنہا زیاد"

"تمام مومنین کی ماں کی طرف سے اپنے بیٹے زیاد کے نام[3]"

لیکن بعد میں جب حقیقت حال سامنے آئی تو خود حضرت عائشہؓ نے زیاد کو "زیاد بن ابی سفیان" کے نام سے خط لکھا۔ حافظ ابن عساکرؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ مرۃ قبیلے کے لوگ زیاد کے پاس حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا سفارشی خط لیجانا چاہتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ زیاد کو "ابن ابی سفیان" لکھتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ اس لئے حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے حضرت عائشہؓ نے صاف یہ الفاظ لکھے کہ:-

"من عائشۃ ام المومنین الی زیاد بن ابی سفیان"

ام المومنین عائشہؓ کی طرف سے ابوسفیان کے بیٹے زیاد کے نام"

جب زیاد کے پاس یہ خط پہنچا تو اس نے خوش ہو کر یہ خط مجمع عام میں سنایا[4]

ان حالات میں ہمیں یہ توقع رکھنا بے محل نہیں کہ مولانا مودودی صاحب بھی مجموعی صورت حال سے واقف ہونے کے بعد اپنے اس اعتراض سے رجوع کرلیں گے، اور انھوں نے اس معاملے میں عام معترضین سے زیادہ جو سخت اور مکروہ اسلوب بیان اختیار فرمایا ہے اس پر ندامت کا اظہار فرمائیں گے ۔؟

(باقی آئندہ)

---

[1] الاستیعاب ص ۵۵۱ تا ۳ / ۵۵۵ ج ۱ (تحت الاصابہ) [2] الطبری۔ ص ۱۶۳ ج ۴

[3] ابن خلدونؒ ص ۱۷ و ۱۸ ج ۳

[4] تہذیب ابن عساکر، ص ۴۱۱ ج ۵ مطبعۃ الروضۃ، الشام ۱۳۳۲ھ

از:
مولانا نور محمد اعظمی
بنگلہ سے ترجمہ:
(مولانا) محمد ہارون اسلام آبادی

اِسلام کے چند مَعاشی اصُول

پیش نظر مضمون مولینا نے بسلسلۂ ترجمہ وتشریح مشکوٰۃ المصابیح بنگالی زبان میں تحریر فرمایا ہے، چونکہ مضمون مختصر ہونے کے باوجود اسلامی معاشیات سے متعلق اہم مباحث پر مشتمل ہے اس لئے خاکسار اس کا اردو ترجمہ پیش کررہا ہے۔ (مترجم)

زیر نظر مقالہ میں متفرق طور سے اسلام کے بتائے ہوئے ان حدود واصول کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو انسان کے معاشی مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن کو پیش نظر رکھ کر اسلام کے معاشی نظام کو مستنبط کیا جاسکتا ہے۔

(۱)

اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اس لئے دولت کو انسانی زندگی کا ایک اہم عنصر قرار دیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حلال روزی کا طلب کرنا دوسرے درجے کا فریضہ ہے" اور یہ بھی فرمایا: "فقر انسان کو کفر تک پہنچا سکتا ہے۔" بایں ہمہ اسلام دولت کو منتہائے مقصد قرار نہیں دیتا۔ انسانی زندگی کا منتہائے مقصد انفرادی اور اجتماعی اخلاقی ترقی اور آخرت کی بہبود ہے کسی چیز کا ضروری ہونا اور بات ہے اور اس کا مقصد ہونا اور بات۔ مسافر کے لئے زاد راہ بہت ہی ضروری ہے۔ لیکن زاد راہ قطعاً اس کا مقصود نہیں ہوتا۔ یہ ہے اسلامی اقتصادیات کا وہ بنیادی نظریہ جو ہر حال میں پیش نظر رکھنا چاہیے۔

(۲)

اللہ تعالیٰ نہ صرف اس کائنات کا خالق ہے بلکہ وہ اسکا رب یعنی پالنے والا بھی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے شروع ہی میں اس نے اپنے آپ کو رب العالمین کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: "زمین میں ایسا کوئی جاندار نہیں جس کی روزی کا ذمہ دار اللہ نہ ہو" (ہود: ۶) اسی ربوبیت ہی کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کی تمام ضروریات کو اپنی اپنی جگہ مناسب طور پر پیدا کر رکھا ہے قرآن مجید میں ہے: (الف) "بے شک ہم نے تمکو زمین میں بسایا ہے اور اس میں تمھارے لئے سامانِ زندگی پیدا کیا ہے مگر تم ہو بہت کم شکر گذار" (اعراف: ۱۰)

(ب) "اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو پیدا کیا اور زمین کو اور آسمان سے پانی اُتارا، پس اس سے نکالا پھلوں کو بطور تمہارے رزق کے، اور اس نے کشتیوں کو تمھارے تابع فرمان بنایا (تاکہ وہ تم سے اور تمہارے سامانِ تجارت سے لدی ہوئی) سمندروں میں چلیں اس کے حکم سے، اور اس نے تمھارے کام میں لگایا دریاؤں کو اور کام میں لگایا تمھارے لئے سورج اور چاند کو رواں دواں کرکے۔ اور کام میں لگایا تمھارے لئے رات اور دن کو، الغرض اس نے تم کو دیں وہ تمام چیزیں جو تم نے چاہیں۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے۔ (ابراہیم:)

(۳)

اسلام منصفانہ تقسیم دولت کا علمبردار ہے وہ چاہتا ہے کہ ہر حق دار کو اس کا حق انصاف کے فطری اصولوں کے مطابق ملے رزق اور دولت میں انسانوں کے درمیان مکمل برابری اسلام کی نظر میں نہ قابلِ عمل ہے اور نہ موافق مصلحت۔ اس سلسلے میں ارشاد خداوندی ہے؛

(الف) "اللہ ہی رزق کو کشادہ کر دیتا ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے وہ چاہے اور (رزق) تنگ کر دیتا ہے جس کے لئے وہ چاہے" (عنکبوت۔ ۱۲۸)۔ (ب) نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوٰۃ الدنیا و رفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا (زخرف: ۳۲) "ہم نے حیاتِ دُنیا میں ان کے لئے ان کے اسبابِ معیشت کو تقسیم کیا اور کسی کے مقابلہ میں کسی کو فوقیت دی تاکہ ایک دوسرے کو کام میں لگا سکے۔" (ج) "وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے بلند درجہ دیا تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔" (انعام۔ ۱۲۵)

---

(۴)

اسلام شخصی آزادی کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس کے نزدیک فرد ہی اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:" اور کوئی اٹھانے والا نہیں اُٹھائے گا بوجھ دوسرے کا (یعنی ایک کے جرم کی سزا دوسرے کو نہیں ملے گی) اس لئے اسلام انسان کو سیاسی آزادی کی طرح معاشی آزادی بھی عطا کرتا ہے۔ اور انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے یہ آزادی ناگزیر بھی ہے البتہ وہ مال کے کسب و صرف کی ایسی حدود متعین کر دیتا ہے جو کبھی توڑی نہیں جا سکتیں لہٰذا اسلام میں شخصی آزادی سے مُراد بے قید خود مختاری نہیں ہے۔

(۵)

اسلام نے سُود رشوت جوئے کی کمائی، دھوکے سے مال حاصل کرنے، ناپ تول میں کمی کرنے، غصب کرنے، حکام کے متعلقہ آدمیوں سے تحفہ قبول کرنے اور صحت مند توانا آدمی کے کسی سے سوال کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح فحاشی و شرک کی مویدات اور ناپاک و حرام چیزوں کو ذریعہ معاش بنانے سے بھی منع کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

سُود: (الف) "احل اللہ البیع وحرم الربوا" یعنی اللہ نے حلال کیا خرید و فروخت کو اور حرام کیا سُود کو (بقرہ ۲۷۵)۔ (ب) "اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سُود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو، اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔ ہاں اگر تم سُود سے توبہ کرو گے تو تمکو تمھارا رأس المال مل جائیگا (ایسا اس لئے کیا گیا) تاکہ تم کسی پر ظلم نہ کرنے پاؤ اور نہ تو کوئی تم پر ظلم کرنے پائے۔ (بقرہ: ۲۷۹)۔ (ج) حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ "رسول اللہؐ نے لعنت فرمائی ہے سُود

والے سود دینے والے سودی دستاویز لکھنے والے
اور اس پر گواہی دینے والے پر اور فرمایا کہ خدا کی
پھٹکار میں یہ سب برابر ہیں" (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

رشوت: (الف) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے ایمان والو تم ایک
دوسرے کا مال باطل طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ
حکام کو (بطور رشوت) کچھ دو تاکہ تم کھا سکو
لوگوں کے مال کا ایک حصہ ناحق، حالانکہ تم کو اس
بات کا علم ہے" (البقرہ: ۱۸۸)۔ (ب) رسولِ خدا
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کی لعنت ہے رشوت
دینے والے اور رشوت لینے والے پر"۔ (ابن ماجہ)
(ج) دوسری حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے لعنت فرمائی ہے رشوت دینے والے، رشوت
لینے والے اور اس شخص پر جو ان دونوں کے درمیان
ثالثی کرتا ہو۔ (کنز العمال از مستدرک حاکم)

جوا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "یا ایھا الذین آمنوا انما
الخمر والمیسر والانصاب والازلام
رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم
تفلحون" یعنی اے ایمان والو بات یہی ہے کہ شراب
جوا، بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر (لاٹری) گندی چیزیں
ہیں اور شیطان کے کام سو تم ان سے بچتے رہو تاکہ
تم فلاح پاؤ۔ (مائدہ: ۹۰)

دھوکہ: (الف) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یا ایھا الذین آمنوا
لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان
تکون تجارۃ عن تراض منکم۔ یعنی اے ایمان والو
تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت
کھاؤ مگر جو لین دین کے طریقے سے اور تمہارے فریقین
کی رضامندی سے ہو (النساء: ۲۹)۔ (ب) رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبردار کسی کا مال اس کی دلی
خوشنودی کے بغیر حلال نہیں (بیہقی، دارقطنی، مشکوٰۃ)

(ج) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے پھلوں کے بیچنے سے منع فرمایا جب
تک اس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر نہ ہو (بخاری، مسلم)
(د) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص
خرید و فروخت میں فریب کرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے

ناپ تول: قرآن مجید میں حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی ہے
"اے میرے بھائیو ناپ اور تول انصاف سے کرو اور
لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو (ہود- ۸۵)

غصب: رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص کسی کی
ایک بالشت برابر زمین غصب کرے گا اور بزور
کھائے گا قیامت کے دن سات طبقے زمین اس کی
گردن میں لٹکا دی جائے گی"۔ (بخاری، مسلم)

حکام کا ہدیہ قبول کرنا: (الف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ابن اللتبیہ نامی ایک شخص کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا
واپسی کے بعد اس نے حضورؐ سے کہا یہ مال آپ کا یعنی بیت المال کا
ہے اور یہ مجھے ہدیۃً ملا ہے۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا" میں تم میں سے کچھ لوگوں کو سرکاری کام پر
مقرر کرتا ہوں تو بعض لوگ کام سے واپس آکر مجھ سے کہتے
ہیں کہ: "یہ آپ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ تو کیوں نہ
یہ شخص اپنی ماں کے گھر بیٹھ کر دیکھتا کہ اسے ہدیہ دیا جاتا
ہے یا نہیں؟ خدا کی قسم اگر کوئی شخص اس طرح کی کوئی
چیز لیتا ہے تو میدانِ حشر میں وہ اس کو اپنی گردن پر
ڈھوتا ہوا حاضر ہوگا"۔ (مشکوٰۃ) (ب) خلیفہ دوم
حضرت عمرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو بحرین میں زکوٰۃ وصول
کرنے کے لئے عامل بنا کر بھیجا ابو ہریرہؓ کو ابن اللتبیہ
والا واقعہ یاد نہ تھا اور اپنے عمل کے دوران ہدایا و تحائف
قبول کئے۔ لیکن جب وہ مدینہ واپس آئے تو حضرت
عمرؓ نے یہ مال بحق سرکار ضبط کر لیا۔ (کتاب الاموال)

سوال کرنا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" طاقتور اور صحیح سالم

آدمی کے لئے سوال کرنا حلال نہیں۔ (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

حرام اور فحاشی کی ممانعت: (الف) حدیث میں ہے کہ حضرت جابرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے حرام کر دیا شراب کو، مردہ جانور کو، سور کو اور مورت کی خرید و فروخت کو (بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)۔ (ب) حضرت ابومسعود انصاری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کر دیا ہے زنا کی کمائی اور نجومی کے معاوضہ کو (بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ) (ج) حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کتے کی قیمت اور گانے کا معاوضہ کھانے سے (شرح السنہ بحوالہ مشکوٰۃ)

(۶)

اسلام نے ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دیا ہے۔ یعنی روزمرہ کی ضروریات کو اس نیت سے ذخیرہ کرنا کہ اگر گرانی بڑھے گی تو زیادہ نفع کے ساتھ بیچوں گا۔ بالخصوص قحط کے زمانے میں کھانے کی چیزوں کے ذخیرہ کرنے کو اصطلاح شرع میں اسے احتکار کہا جاتا ہے۔ احتکار سے انسان کی انسانیت کھو جاتی ہے۔ اور احتکار اس کی درندہ صفتی کا پتہ دیتا ہے۔

(الف) ارشاد خداوندی ہے: ہم اچھا سلوک کرو ماں باپ کے ساتھ اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریب کے پڑوسیوں، دُور کے پڑوسیوں، ہم مجلسوں، مسافروں اور اپنے غلام باندیوں کے ساتھ (نساء: ۳۶) اور احتکاران کے ساتھ اچھا سلوک کے بجائے بُرا سلوک ہے۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو ذخیرہ اندوزی کرتا ہے وہ مجرم ہے"۔ (مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

(ج) آپ نے دوسری حدیث میں فرمایا: جو شخص گرانی کے زمانے میں فروخت کرنے کی نیت سے کسی چیز کو چالیس دن تک اپنے پاس روکے رکھے وہ اللہ سے بیزار ہو گیا ہے اور اللہ بھی اس سے بیزار ہو گیا"۔ (رزین بحوالہ مشکوٰۃ)

اور ہمارے فقہاء نے کہا اگر ذخیرہ اندوزی سے بازار میں گرانی پیدا ہو گئی ہو اور لوگوں کو ضرر پہنچ رہا ہو تو حکومت پر واجب ہے کہ ذخیرہ اندوز اور اس کے اہل و عیال کی ضرورت کی مقدار غذائی اجناس کو چھوڑ کر باقی اجناس کو فروخت کرنے کا حکم دے اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو حکومت خود اسے فروخت کر دے اور اس کو مناسب سزا دے۔" (درمختار، باب الحظر والاباحۃ)

(۷)

تمام حالات میں اسلام تعیین نرخ (پرائس کنٹرول) کا حکم نہیں دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا کشادہ کرنے والا اور رزق دینے والا ہے"[1]۔ لیکن اگر سرمایہ دار ظلم پر آمادہ ہو جائیں اور ان کے غیر معتدل طریقہ اختیار کرنے سے گرانی بڑھ جائے تو ماہرین کے مشورہ سے حکومت تعیین نرخ کر سکتی ہے۔ (دُرمختار باب الحظر والاباحۃ)۔ یہ غیر متوازن طریقہ اختیار کرنا یا تعدی کرنا جیسا کہ صاحبِ مال یعنی فروخت کنندہ کی طرف سے ہو سکتا ہے ویسا ہی وہ اس زمانے میں خریدار کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے۔ (پٹ سن کی قیمت خریداروں ہی کی طرف سے موسم سرما میں گرادی جاتی ہے۔) اس لئے وہ بھی اس حکم میں داخل ہے۔

(۸)

اسلام نے فضول خرچی کو حرام قرار دیا ہے اگرچہ یہ فضول خرچی کسی نیک کام میں کیوں نہ ہو۔

(الف) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "کھاؤ پیو مگر اسراف مت کرو اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" (اعراف: ۳۱)

(ب) دوسری جگہ فرمایا: "تم فضول خرچی مت کرو کیونکہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔" (بنی اسرائیل ۲۶)

(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو بشرطیکہ اسراف اور غرور تم کو نہ چھوئے" (بخاری)

(د) ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ

[1] ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ۔

کو وضو میں ضرورت سے زائد پانی خرچ کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا:
"سعد! یہ اسراف کیوں؟ سعدؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ وضو میں بھی اسراف ہے؟ حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: "ہاں ضرور! اگرچہ تم بہتی ہوئی ندی کے کنارے پر ہو" (اس سے معلوم ہوا کہ نیک کام میں بھی اسراف پایا جاسکتا ہے) (مسند احمد و ابن ماجہ)

(۹)

اسلام نے سونے چاندی کے برتنوں (یعنی سامان) کے استعمال اور مردوں کے لئے ریشم کے استعمال کو ممنوع قرار دیا ہے۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانے اور پینے سے منع فرمایا ہے اور اسی طرح ریشم کے کپڑے پہننے اور اس پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے۔" (بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

اسلام ظاہری زیب وزینت میں حد سے زیادہ انہماک کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ اسے بھی ایک گونہ اسراف ہی قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

(الف) "کیا تم ہر اونچی جگہ پر کھیلنے کے لئے نشان تیار کرتے ہو اور تعمیر کرتے ہو بڑے بڑے محل جیسے کہ تم دنیا میں ہمیشہ رہو گے۔؟" (شعراء ۱۲۹)

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مومن جو بھی خرچ کرتا ہے اس میں اس کو اجر ملتا ہے مگر جو خرچ کہ مٹی میں کرتا ہو" (ترمذی وابن ماجہ)

(ج) آپؐ نے یہ بھی فرمایا: "ہر عمارت اپنے مالک کے لئے باعث وبال ہے مگر جو نہایت ضروری ہو مگر جو نہایت ضروری ہو" (ابوداؤد)

(۱۰)

اسلام کسی ایک فرد یا چند مخصوص افراد کے ہاتھوں میں قومی دولت کے مرتکز ہونے کو ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ لہذا اسلام کسی حکومت یا ادارے کو ایسی پالیسی اختیار کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا جس کے نتیجے میں زمین، ملکی تجارت وصنعت یا دیگر ذرائع معاش چند افراد کے ہاتھوں میں محدود ہو جائیں بلکہ اس کے برعکس اسے زیادہ سے زیادہ افراد میں پھیلانے کا حکم دیتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اہل قریٰ (یعنی بنی نضیر) کا جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو بطور فئی کے عطا کیا ہے وہ اللہ کے لئے، رسولؐ کے لئے، رسولؐ کے رشتہ داروں کے لئے، یتیموں کے لئے، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ یہ مال گھوم پھر کر تمھارے دولت مند افراد کے ہاتھوں محدود نہ رہ جائے۔" (الحشر: ۷)

(باقی آئندہ)

عبدُ الکریم عابد

رُوسی ترکستان میں سوشلزم

سمرقند، بخارا، تاشقند اور رُوسی ترکستان کے دوسرے حصّوں میں اسلامی سوشلزم کے حامیوں کی خوش فہمیاں اور انکا حسرتناک انجام

پاکستان کو روس، چین بالخصوص چین کے ساتھ انتہائی خوشگوار تعلقات رکھنے چاہئیں ۔ یہ وہ نقطۂ نظر ہے جو میں نے آج سے کئی سال پہلے لاہور، راولپنڈی اور ملتان سے شائع ہونے والے روزنامہ کوہستان کے ایک مضمون میں اس وقت ظاہر کیا تھا جب سابق صدر ایوب نے بھارت کو مشترکہ دفاع کی پیش کش کی تھی۔ میں نے اس مضمون میں لکھا تھا کہ صدر کا یہ کہنا کہ شمال کی جانب سے خطرہ بڑھ رہا ہے اور اس خطرے کے پیش نظر پاک و ہند کو مشترکہ دفاع کرنا چاہیئے غلط ہے۔ اس کے بعد جب مسئلہ کشمیر پر سورن سنگھ بھٹو مذاکرات ہو رہے تھے تو میں نے روزنامہ کوہستان میں ہی ایک اور مضمون لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ مسئلہ کشمیر پر یہ بات چیت سامراجیوں کا پھیلایا ہوُا ایک جال ہے۔ اس کے ذریعہ وہ چین کے خلاف ہندوستان اور پاکستان کا متحدہ محاذ بنانا چاہتے ہیں۔ جبکہ پاکستان کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ وہ چین کو اپنا دوست بنائے اس مضمون میں صدر ایوب اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سامراجیوں کے اشارے پر جس خارجہ پالیسی کو اختیار کئے ہوئے ہیں اس سے وہ دستبردار ہو جائیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بعد میں حالات کا ارتقاء کچھ اس طرح کا رہا کہ صدر ایوب اور مسٹر بھٹو دونوں نے چین سے دوستی کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے دو سال پہلے اخبار جہاں میں وقائع نگارِ خصوصی کی حیثیت سے چین کی ریڈ گارڈز تحریک کے ان چند مفید نکات کی تشریح و توضیح کی جو پسماندہ ملکوں اور اقوام کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن روس اور چین کی دوستی کے نہ یہ معنی ہیں نہ اس کے لئے یہ شرط ہے کہ ہم اپنے عقائد، نظریات اور طرزِ زندگی سے دستبرداری اختیار کریں۔ ہمیں اپنے موجودہ حالات اور اپنی پچھلی تاریخ کو یاد رکھنا چاہیئے۔

رُوس اور چین سے دوستی وقتی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر نہیں ہے اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ روس اور چین کے مسلم علاقے رقبے کے اعتبار سے بھی متعدد مسلمان مُلکوں سے زیادہ آبادی رکھتے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان اسلام کا ناقابلِ شکست رشتہ ہے۔ اور اس رشتہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سے اپنے روابط استوار کریں۔ انھیں اپنے نزدیک آنیکا موقع
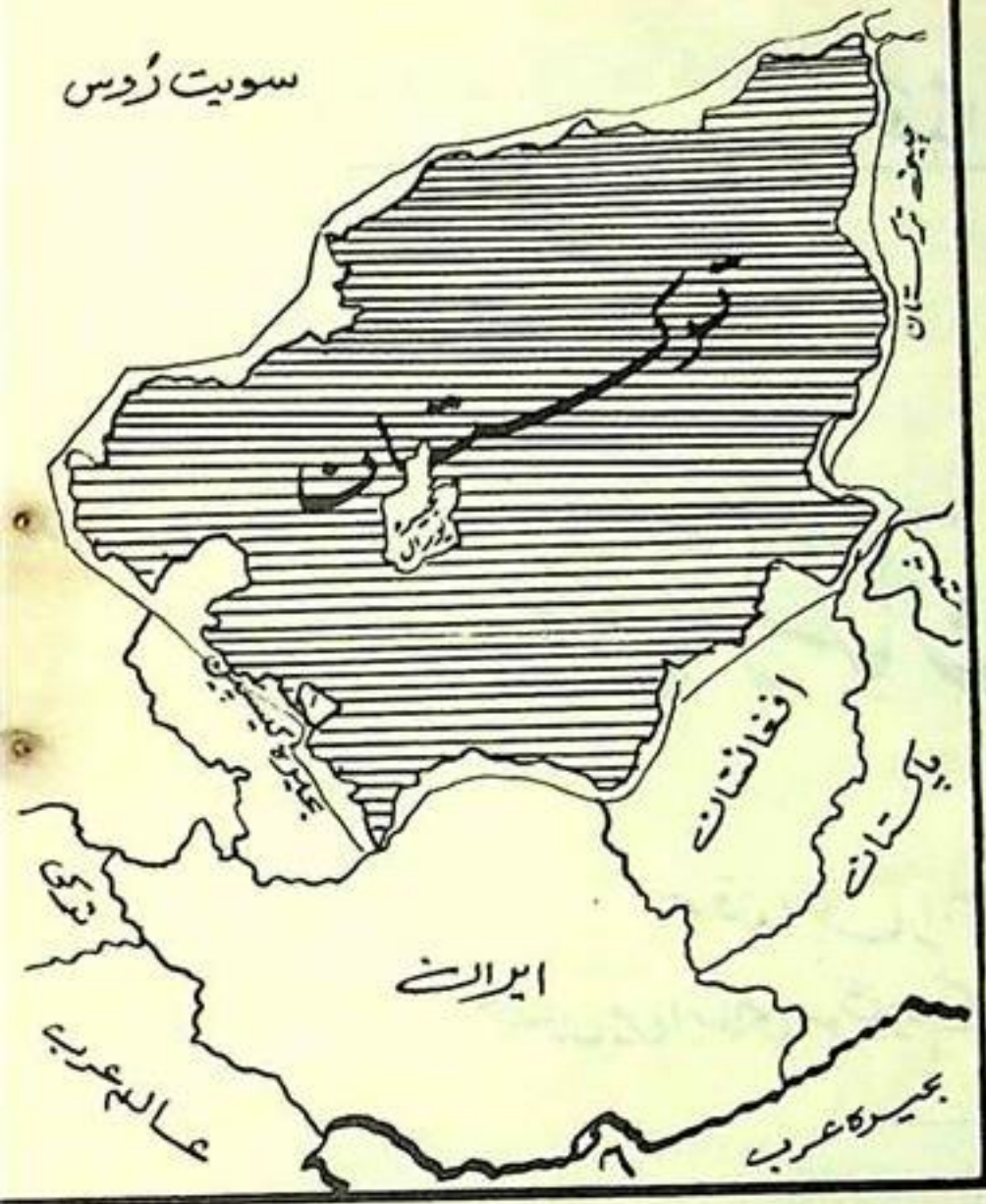
دیں۔ اور ہم ان کے قریب ہونے کی راہ تلاش کریں تاکہ مسلمان ہونےکی حیثیت سے ہم ان پر اثر انداز ہو سکیں، وہ ہم کو متاثر کریں۔ یہ اثر و نفوذ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ان ملکوں سے پاکستان کے تعلقات نہایت خوشگوار رہیں، صرف اسی طرح یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے علماء اساتذہ، طلباء صحافیوں، تاجروں اور وکیلوں کے وفود روس کے ترکستان اور چین کے سنکیانگ کا دورہ کریں۔ ان علاقوں کے حالات بچشم خود دیکھیں اور پھر ان مسلمانوں کے نمائندہ وفود ہمارے ملک میں آئیں اور دیکھیں کہ ہم کیا کچھ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اس طرح پاکستان اور عالم اسلام کے ان عظیم علاقوں کے درمیان جو اب تک ایک دوسرے سے کٹے رہے اور الگ تھلگ رہے، ذہنی و روحانی تعلق پیدا ہو گا، اقتصادی روابط استوار ہوں گے۔

مگر یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم روس اور چین سے خوشگوار تعلقات کو بنیادی اہمیت دیں اس کے ساتھ ہی اپنے اصل وجود کو گم یا فراموش نہ کریں۔ اس وجود کو بھول جانے اور اپنے اصل اوصاف کو کھو دینے کے بعد ان مسلم علاقوں کے لئے ہماری ذات میں کوئی کشش نہیں رہے گی اور ہم ان کے لئے بیکار ہو کر رہ جائیں گے جب تک ہم مسلمان ہیں اور ہمارا اسلامی ذہن و فکر زندہ ہے ساری دُنیا کے مسلمان ہمیں احترام اور محبت کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اور یہ بات نہ رہی تو پھر آخر ہم میں سرخاب کے ایسے کیا پر لگے ہیں کہ کوئی ہماری طرف مائل ہو۔

روس اور چین کے مسلم علاقوں کے مُسلمان پاکستان سے بڑی محبت رکھتے ہیں اور وہ ہم سے بڑی توقعات بھی رکھتے ہیں۔ اس محبت اور ان توقعات کی بنیاد ہمارا مذہب "اسلام" ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ باہمی محبت اور توقعات کی اس بنیاد کو ہم روز بروز مضبوط بنائیں گے۔ اور درحقیقت اسی غرض سے ہم نے پاکستان بنایا تھا کہ خاکِ ہند کی تنگنائیوں سے اٹھ کر سمر قند و بخارا تک پہنچ سکیں۔

روس اور چین سے پاکستان کے خوشگوار تعلقات کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کی تاریخ سے صحیح صحیح واقفیت حاصل کریں۔ تمام حالات بلے کم و کاست ہمارے سامنے آئیں ورنہ جو دوستی ہوگی وہ جھوٹی دوستی ہوگی۔ بلکہ دوستی نہیں منافقت ہوگی۔ تاریخ میں اچھا بھی ہے بُرا بھی اور جو بُرا ہے اُسے دبا چھپا کر رکھنے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ آنجہانی اسٹالین کے دور میں انھیں رُوسی ترکستان پر جبر و تشدد کرنا پڑا۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ ایک قصۂ ماضی ہے اور اس پر سرسری نظر ڈالنا اس لئے ضروری ہے کہ ہم ماضی سے سبق سیکھیں! اور ماضی کی تاریکیوں کو مستقبل پر اثر انداز ہونے کا موقع نہ دیں۔ (عبد الکریم عابد)

ترکستان دُنیا کے نقشے سے مٹ گیا اس کا ایک بڑا علاقہ جو چینی ترکستان کہلاتا ہے، چین میں ہے اور دوسرا بڑا علاقہ جس کو روسی ترکستان کہا جاتا تھا، سوویٹ سوشلسٹ ری پبلک کا ایک حصہ ہے۔

رُوسی ترکستان کے بارے میں چین کا موقف یہ ہے کہ روس ایک یورپی طاقت ہے آخر اس یورپی ملک کو کیا حق ہے کہ وہ ایک بڑے ایشیائی ملک کو اپنے قبضے میں رکھے۔ دُنیا کے ہر یورپی سامراج نے

اپنے ایشیائی مقبوضات کو آزادی دی ہے لیکن رُوس نے ابھی تک وسط ایشیا کے مسلم علاقے کو آزاد نہیں کیا اس محکوم علاقے اور رُوس میں یہی فرق نہیں کہ ایک ایشیا میں ہے دوسرا یورپ میں بلکہ زبان نسل رنگ مذہب ہر چیز میں وہ رُوس سے الگ ہے۔

چین کے مقابلے میں روس کا کہنا یہ ہے کہ چینی ترکستان اپنی مسلم ثقافت و تہذیب کے اعتبار سے ایک قطعی جداگانہ چیز ہے اسے چین کا جزو زبردستی بنایا گیا ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اب ان مسلمانوں پر ریڈ گارڈز طرح طرح کے بھیانک مظالم ڈھا رہے ہیں۔ ان کی مسجدیں مسمار کی جا رہی ہیں اور مسلمان لڑکیوں کو پکڑ کر زبردستی ان کی شادیاں چینیوں سے کرائی جا رہی ہیں۔ اس طرزِ عمل کی وجہ سے سنکیانگ اور دوسرے علاقوں کے عوام آمادہ بغاوت ہیں۔ ان کی بغاوت کو اسلحہ کے زور پر دبایا جا رہا ہے۔

چین اور روس کے ان بیانات میں سے کوئی بھی صداقت سے عاری نہیں ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہنگری اور چیکوسلواکیہ کے عوام کی طرح روسی اور چینی ترکستان کے عوام بھی کمیونزم کے فریب میں آئے اور اب ان کے اس جال سے نکلنے کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی۔ روسی ترکستان اور چینی ترکستان دونوں جگہ کے عوام غلام ہیں اور کوئی نہیں جو ان کی غلامی کے خلاف آواز بلند کرے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ رُوس کی عظمت و طاقت کا راز سوشلزم میں ہے لیکن یہ رُوس اگر آج ترکستان کے علاقے سے جو رقبے میں بھارت سے بڑا ملک ہے اور پاکستان سے تقریباً چار گنا ہے، دستبردار ہو جائے تو روسی سوشلزم کی اقتصادی عمارت زمین پر آ رہے گی۔ یہ سوشلزم نہیں بلکہ وسط ایشیا کے مسلم علاقے ہیں جن پر قبضہ کی وجہ سے روس آج مالا مال ہے۔

رُوس اور چین ہوں یا مغربی ممالک ہمیں ان سے تعلقات خوشگوار رکھنے چاہئیں اور انسانی مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے باہمی تعاون بھی کرنا چاہیئے۔ لیکن اچھے اور خوشگوار تعلقات کی ضرورت تسلیم کرنے کے باوجود یہ نہیں فراموش کرنا چاہیئے کہ ان سب مُلکوں نے پچھلی صدیوں میں اُمّتِ مسلمہ کو مردہ نعش سمجھ کر اس کی بوٹیاں نوچی ہیں۔ اور آج جو طاقتیں ہمیں بڑی نظر آتی ہیں وہ "ڈیموکریسی یا سوشلزم کی وجہ سے بڑی نہیں ہوئیں۔ ان کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے وسیع و عریض علاقے ہڑپ کئے۔ رُوس بھی اسی طرح بڑا بنا۔

ترکستان۔ حسین آغاز، تاریک انجام

بنو امیہ کے عہدِ حکومت میں حجاج نے محمد بن قاسم کو سندھ اور قتیبہ بن مسلم کو ترکستان فتح کرنے کے لئے روانہ کیا۔ یہ دونوں سپہ سالار اپنے مشن میں کامیاب رہے اور بعد میں سندھ اور ترکستان دونوں ہی اسلامی تہذیب، علوم، ثقافت کے شاندار مراکز بنے۔ یہاں مشہور محدثین، امام بخاری، امام ترمذی، حضرت عبداللہ بن مبارک، فقہاء میں امام ابو منصور ماتریدی، زمخشری کاشغری، جواہری سکاکی، مسلمان فلسفیوں میں فارابی، ابن سینا اور چشتیہ، نقشبندیہ سہروردیہ سلسلے کے مشائخ پیدا ہوئے۔ تیموری، ساسانی، خاقانی غزنوی، سلجوقی اور خوارزم شاہی خاندان سلاطین کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ چنگیز خاں کے پوتے نے رُوس کی چھوٹی سی سلطنت پر حملہ بول دیا اور اسے اپنا باج گذار بنا دیا۔ اس کے بعد یہ روسی سلطنت مسلمان تاتار بادشاہوں کو خراج ادا کرتی رہی۔ لیکن تاتاری آپس کی خانہ جنگی میں الجھ گئے۔ دوسری طرف روسی رجواڑوں کے بطن سے ایک متحدہ روسی طاقت ابھری اس نے اردگرد کے علاقوں کو فتح کرنا شروع کیا۔ یہ تھی عظیم روس کی ابتدا۔

۱۸۶۰ء میں روس کے وزیرِ خارجہ نے یورپ کی حکومتوں کو سرکلر بھیجا اس میں کہا گیا تھا:

> "جب ایک مہذب ملک اور قوم کا سابقہ کسی وحشی قوم سے ہوتا ہے تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ تہذیب سکھانے والی قوت اپنی سرحد

مسلسل بڑھاتی اور پھیلاتی رہے۔"

پھر یہ سرحد بڑھائی اور پھیلائی گئی ۱۸۶۵ء میں رُوس نے تاشقند پر قبضہ کیا۔ پھر بخارا اور خیوا کے امیر خان نے خراج ادا کرنا منظور کیا۔

۱۸۸۱ء تا ۱۸۸۴ء میں روسیوں اور ترکمانیوں کے درمیان خونریز جنگ ہوئی اس میں روسی فاتح رہے اس طرح ترکستان پر روسی قبضہ مکمل ہوگیا۔ یہ قبضہ آسانی سے نہیں ہوا تھا۔ رُوس کا فوجی مورخ جنرل تابیف لکھتا ہے:

"کوہستان قفقاز کی فتح کے لئے ہمیں اتنے بڑے لشکر سے ہاتھ دھونا پڑا جو ہندوستان سے جاپان تک پھیلے ہوئے سارے ملکوں کو فتح کرنے کے لئے کافی تھا"

اس فتح کے بعد بھی بغاوتوں اور آزادی کی تحریکوں کا سلسلہ جاری رہا ترکستان پر بیالیس سالہ شاہی استبداد کے دَور میں پندرہ بڑی بغاوتیں ہوئیں۔ داغستان میں اکیلے امام شامل پچیس برس تک رُوسی سامراج سے جنگ کرتے رہے آزادی کی ان تحریکوں کو ایسے بھیانک مظالم سے دبایا گیا کہ اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ چند حقائق ملاحظہ کیجئے:

- ترکستان میں ۱۸۹۶ء کی ناکام بغاوت کے بعد ترکستان کے روسی وائسرائے جنرل دوخوفیسکوئی نے علاقے کے مولویوں کو جامع مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ پھر انھیں سنگینوں کے سائے میں اپنے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کیا اور جب وہ زبردستی سجدے میں گرائے گئے۔ تو یہ وائسرائے ان کی گردنوں پر پاؤں رکھتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا۔
- روسی وائسرائے جنرل ساموتوف نے حکم دیا کہ جب روسی افسر راستے سے گذریں تو ترکستانی لوگ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، گردن خم کرلیں۔ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جائیں۔
- شہنشاہ پیٹر نے ۱۸۱۲ء میں حکم جاری کیا کہ جو غیر روسی باشندہ چھ ماہ میں عیسائیت اختیار نہیں کریں گے ان کی اراضی ضبط کرلی جائے گی۔

لیکن زار کی وحشیانہ حکومت کے مظالم جوں جوں بڑھتے گئے عوام کا جذبۂ آزادی بھی ترقی کرتا گیا۔ سوشلسٹ انقلاب سے ایک سال پہلے جولائی ۱۹۱۶ء میں ایک اور بڑی بغاوت ہوئی۔ حکومت زار نے اسے سلطنتِ روس کے خلاف "پان اسلام ازم" اور "پان ترک ازم" کے حامیوں کی مسلح بغاوت قرار دیا۔ ترکستان کے گورنر جنرل کروپٹکن نے کہا کہ یہ بغاوت انور پاشا کی سازش ہے۔ بغاوت ۱۳ جولائی ۱۹۱۶ء کو شروع ہوئی اور ختم سال تک رہی۔ زار نے ہیبتناک توپوں سے لیس ایک لاکھ روسیوں پر مشتمل فوج ترکستان بھیجی۔ اس فوج نے آٹھ لاکھ ترکستانیوں کو ہلاک کیا۔ اور بغاوت کے ۳۴۷ سرغنوں کو جنرل کروپٹکن کے حکم سے شارع عام پر پھانسی دی گئی۔

بغاوت کی ناکامی کے بعد ترکستانی اس نتیجہ پر پہنچے کہ تن تنہا کچھ کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ آزادی کے لئے رُوس کے حریت پسند، روشن خیال اور انسان دوست رہنماؤں کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے۔ عین اس موقع پر سوشلزم کے علمبرداروں نے یہ پیشکش کی کہ اگر مسلمان ان کا ساتھ دیں تو زار کی حکومت ختم ہونے کے بعد انھیں آزاد قوم اور آزاد ملک تسلیم کرلیا جائے گا۔

یہاں سے سوشلزم کے حامیوں اور اسلام لیڈروں کے درمیان تعاون کا آغاز ہوا۔ ایک نئی اصطلاح "اسلامی سوشلزم" سُننے میں آئی۔ خریدے ہوئے مُلّاؤں نے قرآن و حدیث کھنگال کر فتاویٰ جاری کئے، کہ سوشلزم عین اسلام ہے۔ غازی جمال پاشا اور غازی انور پاشا بذاتِ خود ترکی سے نکل کر اپنے اس آبائی

علاقۂ ترکستان میں آئے۔ انھوں نے روسی انقلابی رہنماؤں سے مضبوط رفاقت کا رشتہ قائم کیا اور یہ رشتہ عرصہ تک رہا۔ غازی انور پاشا نے ۱۹۲۱ء میں مشرقی عوام کی کانگریس منعقدہ باکو میں تقریر کرتے ہوئے بالشویکوں کے نظریات وخیالات سے مکمل اتفاق کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ وہ وقت بہت قریب ہے جب دُنیا کے محکوم ومظلوم عوام دیکھیں گے کہ ان کی نجات انقلابِ روس میں مضمر ہے۔ ان ساری حسین توقعات کی بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ جو ہمارے دُشمن کا دشمن ہو وہ ہمارا دوست ہے۔ کمیونسٹ چونکہ زار روس کے دشمن تھے اس لئے انھیں مسلمانوں نے اپنا دوست سمجھ لیا۔ لیکن ترکستانی مسلمانوں کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔

جب زار روس قتل کر دیا گیا اور اشتراکی انقلاب آیا تو ترکستان کے محکوم علاقوں نے اپنی آزادی اور روس سے علیحدگی کا اعلان کر دیا انھوں نے اپنی آزاد حکومتیں بھی بنالیں۔ سب کو توقع تھی کہ سوشلسٹ رہنماؤں نے ان کی آزادی کو تسلیم کرنے کا جو وعدہ کیا ہے وہ حقیقت بنے گا۔ لیکن اس وعدے کی تکمیل کے بجائے مرکزی انقلابی حکومت نے سُرخ فوج کو ترکستان روانہ کیا اور اس سُرخ فوج نے ازسرِنو ترکستان فتح کیا اور اسے روس کا جزو بنالیا۔

ترکستان ۔ سونے کی چڑیا

دراصل انقلابی رہنما اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ روس کی ترقی کے لئے "سوشلزم" سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ وسط ایشیا کا علاقہ روس کے قبضے میں رہے۔ یہ علاقہ جو رقبے میں بھارت سے بھی بڑا ہے اور ہر طرح کی معدنی اور زرعی دولت رکھتا ہے۔ اگر روس کے ہاتھ سے نکل جائے تو روس خواہ سوشلزم اختیار کرے یا کوئی اور ازم وہ خوشحال نہیں بن سکے گا۔ اس سلسلے میں صرف چند حقائق پر غور کیجئے:

- روس کی تیل (پٹرول) کی پیداوار کا ۸۳ فیصد آذربائیجان کے علاقہ باکو سے آتا ہے۔ آذربائیجان کا یہ علاقہ روس کا اپنا نہیں۔ یہ اس نے ایران سے چھین لیا تھا۔
- روس معدنیات کے لحاظ سے دنیا کا پہلا دولتمند ملک ہے اور یہ ساری دولت یورال کی پہاڑیوں اور تاتاریوں کے علاقے میں پائی جاتی ہے۔ اور اسی علاقہ سے روس خاص کے لئے اناج جاتا ہے۔
- کپاس کی پیداوار میں امریکہ اور چین کے بعد تیسرا نمبر "ازبکستان" کا ہے۔ یہ ازبکستان ترکستان کے علاقے میں ہے۔ اور اسکی کپاس سے نہ صرف روس کی ٹیکسٹائل ملیں چلتی ہیں بلکہ یہ زرمبادلہ کمانے کا بھی بڑا ذریعہ ہے۔
- وسط ایشیا کی ایک اہم فصل چقندر کی تھی اور انیسویں صدی سے رُوس سلطنت کی شوگر انڈسٹری کا دارومدار اسی علاقہ کی فصل پر رہا ہے۔
- یورال کے سلسلۂ کوہ میں جہاں تاتاری اور دوسرے مسلم قبیلے بستے تھے لوہے کی کانوں کو اٹھارہویں صدی میں ترقی دی گئی تھی اور اس سے روس لوہے کا سب سے بڑا ایکسپورٹر بن گیا تھا۔
- کوئلہ، تیل، پلاٹینم، لوہا، سونا، چاندی، تانبہ، جواہرات، یورینیم، کرومیم، کپاس جوٹ، ریشم، اناج، پھل، سبزی، جنگلات، مویشی اور قدرتی کھالوں کے وسیع اور بے پایاں ذخائر مسلمانوں کے ان علاقوں میں تھے اور ہیں۔
- ترکستان کی زمین نہایت زرخیز ہے مثلاً ازبکستان دُنیا میں کپاس کی پیداوار کے اعتبار سے پہلے نمبر پر خام سلک اور جوٹ کی پیداوار میں دوسرے نمبر پر۔ ازبکستان رقبے میں برطانیہ

بلجیم، ہالینڈ، آسٹریلیا، اور سوئٹزرلینڈ ان سب ملکوں کے مجموعی رقبے کے برابر ہے اور اس وسیع رقبے میں پھلوں کے باغات ہی باغات ہیں یہاں چھ سو اقسام کے انگوروں، دو سو چالیس طرح کے سیب اور تین سو ورائٹی کے آڑو ہوتے ہیں۔ آذربائجان میں جہاں تیل کے اہم ترین چشمے ہیں۔ مصری کپاس بہت ہوتی ہے۔ قازقستان رقبے میں پاکستان سے تین گنا بڑا ہے۔ اس میں لوہا، کوئلہ، ٹین سب پایا جاتا ہے۔

● روس کی سوشلسٹ پارٹی اس سونے کی چڑیا کو اپنے ہاتھ سے کیوں جانے دیتی۔ اسلئے ترکستانی عوام سے آزادی کے وعدے کے باوجود انھیں آزادی نہیں دی گئی اور جب سوشلسٹ حکومت نے بھی ترکستان کے معاملے میں روس کا رویہ اختیار کیا تو اسکا ٹکراؤ یہاں ترک ازم اور یہاں اسلام ازم کی تحریکوں سے ہوا۔

روسی سامراج اور حق خود ارادیت

لینن نے کہا تھا:

"سلطنت روس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی آبادی کی اکثریت یعنی ۵۷ فیصد آبادی غیر روسی ہے اور روس کی محکوم ہے۔ پھر یہ سرحدی علاقوں میں رہتی ہے اور جیسا ظلم ان پر ہوتا ہے ویسا کہیں نہیں ہوتا جبکہ انہی کے ہم قوم سرحد کے پار آزادی اور خوشحالی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ پھر ان غیر روسی علاقوں میں معیشت اور تہذیب کا ارتقا خود روسی علاقے سے زیادہ ہے۔ ان میں جدید معیشت تیزی سے ابھر رہی ہے۔ یہاں تہذیب کی سطح بھی بلند ہے اور ہمسایہ ایشیائی ریاستوں میں تو سرمایہ داری کے صنعتی انقلاب اور قومی تحریکوں کے دور کا آغاز ہو گیا ہے۔ اور یہ روس کی سرحدوں کے اندر بھی اپنا اثر ڈال رہی ہیں اس بنا پر ہمیں ان قوموں کا حق خود ارادیت تسلیم کرنا ہوگا۔"
(قومیت کے مسئلہ اور حق خود ارادیت پر لینن کی تقریریں، ص: ۴۹)

لینن کی تحریر کا ایک اور حوالہ:

"روس میں محکوم اور مظلوم اقوام کا تناسب مقامی آبادی میں ۵۷ فی صد یعنی دس کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ اور یہ سب لوگ سرحدی علاقوں کے رہنے والے ہیں اور ان میں بعض ایسی قومیں ہیں جن کی تہذیب اور جن کا تمدن روس سے زیادہ عظیم اور شاندار ہے۔ اس کے باوجود وہ ایک بربریت اور وحشت سے پر سیاسی نظام کا شکار رہیں۔ ہمیں روس میں قوموں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرنا ہی ہوگا۔" (ایضاً ص: ۵۰)

لیکن جب انقلاب آ گیا تو اس "حق خود ارادیت" کا ایسا مفہوم بتایا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ترکستانی علاقے روس کی مرکزی حکومت کے غلام بنے رہیں، اور اس مفہوم کو سرخ فوج کی مدد سے زبردستی ان پر مسلط کیا گیا۔ اسٹالن نے یہ نکتہ پیش کیا کہ ہر حالت میں حق خود ارادیت کو مزدوروں کے طبقاتی مفاد کا طابع رہنا چاہیے؛

اس پالیسی کے نتیجہ میں ترکستانی رہنماؤں اور انقلابی رہنماؤں کے درمیان ٹھن گئی۔ جو لوگ کل تک حلیف تھے وہ آپس میں دشمن بن گئے۔ جمال پاشا کو کسی نامعلوم آدمی نے قتل کر دیا۔ انور پاشا کو کمیونسٹوں نے پیش کش کی کہ وہ انھیں ترکستان کا صدر مان لیں گے۔ بشرطیکہ کامل آزادی کے نظریہ سے وہ دستبردار ہو جائیں لیکن انور پاشا نے یہ شرط منظور نہیں کی اس پر انھیں گرفتار کر لیا گیا مگر وہ روسی حراست سے فرار ہو کر ترکستان پہنچے اور وہاں آزاد ترکستان ری پبلک قائم کر کے روسی فوج کو چودہ دن میں ترکی سے نکل جانے کا الٹی میٹم دیا۔ پھر جنگ ہوئی۔ اس میں وہ شہید ہوئے مگر "بساچی تحریک" کے نام سے ترکستانیوں کی گوریلا جنگ کئی سال تک جاری رہی۔ لیکن کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکی۔

تقسیم کرو اور حکومت کرو:

وسط ایشیا میں پہلا اقدام کمیونسٹوں نے یہ کیا کہ انھوں نے
مسلم علاقوں میں اتحاد کی جو تحریک چل رہی تھی اسے رجعت پسندانہ قرار
دیکر ان مسلم قومیتوں کی قومیت، در قومیت اور مسلم علاقوں کی علاقے
در علاقے کے اصول پر ایسی تقسیم کی کہ ان کی سابقہ قومیت و علاقائیت
پارہ پارہ ہوکر رہ گئی۔ ابدال اوراں کو چھ ٹکڑوں میں۔ آذربائیجان
کو چھ حصوں میں، قفقاز کو دس خطوں میں اور ترکستان کو پانچ
علاقوں یعنی ازبکستان، تاجکستان، قزاقستان، قرغیزستان، ترکمانستان
میں تقسیم کر دیا گیا۔

مسلم علاقے اور مسلم قومیت کا تیا پانچا کرنے کی یہ کارروائی
پان ترک ازم اور پان اسلام ازم کی تحریک کو ناکام بنانے کے لئے کی گئی
تھی۔ اس تحریک کا پیام تھا کہ وسط ایشیا کے مسلمان ایک قوم بن کر
آزادی حاصل کریں۔ اور ایک بڑی طاقت بنیں۔ علامہ
جمال الدین افغانیؒ نے ایران، افغانستان، پاکستان اور روسی
ترکستان میں گھوم پھر کر اس تحریک کے لئے بنیادی اہمیت کا سارا
کام مکمل کیا تھا۔ غازی انور پاشا اسی تحریک کے سلسلے میں روسی
ترکستان میں آباد ہو گئے تھے۔

پان تُرک ازم

پان ترک ازم کی بُنیاد اس خیال پر تھی کہ جن لوگوں کی
زبان ترکی لسانی گروپ سے تعلق رکھتی ہے یعنی عثمانی ترکی آذری
تاتاری، قازق ترکمانی ازبک، وہ سب تہذیبی اعتبار سے ایک
ہیں اس لئے اب قدیم قبائلیت کو چھوڑ کر ایک مشترکہ قومیت
اختیار کرنی چاہیئے اور اس قومیّت کے ہیرو وہ مسلمان تاتاری
بادشاہ ہونے چاہئیں جنھوں نے روس پر حملہ کر کے اس سلطنت
کو تین سو سال تک اپنا باج گذار بنائے رکھا۔ زبان کی بنیاد
پر ترکستانی قومیت کا یہ تصور تاتاریوں نے مصطفےٰ کمال پاشا
سے بھی بہت پہلے پیش کیا تھا۔ انھوں نے کوشش کی تھی کہ
رُوس کے محکوم ترک عوام قبائلی سطح سے بلند ہو کر اس ترکستانی
قومیت کو اختیار کریں، ایک مشترکہ ترکی زبان بولیں، قبائلیت کو
چھوڑ کر قومیت اختیار کریں گی یہ دعوت ایک ایسے ماحول میں جہاں
معیشت جاگیرداری عہد سے بڑھ کر سرمایہ داری کے دور میں داخل
ہو چکی تھی ٹھوس اور گہری اقتصادی جڑیں رکھتی تھیں اور اسکا
مستقبل درخشاں نظر آتا تھا۔ اس مکتبِ فکر کی ترجمانی کے لئے
ایک اخبار روسی و ترکی زبانوں میں "ترجمان" کے نام سے جاری ہوا
جو نہایت کثیر الاشاعت تھا۔ اس اخبار نے پان ترک ازم کی
تحریک کو روسی ریاستوں بخارا، خیوا اور ترکستان کے گوشے گوشے
میں پہنچا دیا تھا۔

پان اِسلام ازم

پان اسلام ازم کی تحریک، پان ترک ازم سے ایک قدم
آگے بڑھ کر اس بات کی جانب دعوت دیتی تھی کہ صرف ترکستانی
قومیت کی بنیاد پر ترک علاقوں اور قبیلوں کا ایک ہونا کافی نہیں
ہے۔ ہمیں اس سے بھی زیادہ بڑھ کر وحدت بنانی چاہیئے اور ہم
اسلامی اخوت کی بنیاد پر یہ وحدت بنا سکتے ہیں اس میں ترکی
رُوسی ترکستان، چینی ترکستان، افغانستان، ایران، بلوچستان اور
برطانوی ہندوستان کے دوسرے علاقے شامل ہو سکتے ہیں، ان
سب علاقوں کو ہمیں آزاد کرانا ہوگا۔ اور پھر انھیں ایک وحدت
یا ایک وفاق کی شکل دینی ہوگی۔ صرف اس طرح دورِ حاضرہ میں
عظیم اسلامی طاقت ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔ اور اسلام اور مسلمانوں
کا مستقبل محفوظ ہو سکتا ہے۔ ورنہ چھوٹے چھوٹے مسلمان ملک
جو الگ الگ ہوں بڑی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

پان ترک ازم اور پان اسلام ازم کی یہ تحریکیں روس
کے نقطۂ نظر سے کیسی تھیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل بیانات
سے ہو سکتا ہے۔

"وسطی ایشیا اور قازقستان انقلاب سے پہلے اور بعد"
کے مصنف کے ایچ عنایتوف لکھتے ہیں۔

"اس تحریک کا مقصد وسطی ایشیا کی ایک مرکزی خلافت
وحکومت قائم کرنا تھا جس میں بلوچستان، ایران، افغانستان، بخارا
خیوا اور روسی ترکستان شامل ہوں یعنی رُوس کے مسلم علاقے روس

سے الگ ہو کر اس میں شامل ہو جائیں۔ اس بنیاد پر روس کے مسلم علاقوں کی ایک خود مختار حکومت کوقند کے روسی علاقے میں قائم کر دی گئی۔ اس حکومت کی فوجی کارروائیوں نے روسی ترکستان کے علاقے کو تین بار روس سے کاٹ دیا لیکن ہر بار سرخ فوج اور مقامی ریڈ گارڈز کی مدد سے اس تعلق کو بحال کر دیا گیا۔"

جناب عنایتوف پان ترک ازم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پان ترکش آئیڈیالوجی کا دعویٰ تھا کہ ترکستانی عوام واحد ترک قومیت کے رشتے میں ہیں انھیں اس رشتے کی بنیاد پر ترکوں سے متحد ہو جانا چاہیے۔ اور اس سلسلے میں ترکی خلافت کو اپنا لیڈر بھی مان لینا چاہیے۔"

پان ترک ازم اور پان اسلام ازم کی اس تحریک کا توڑ کرنے کے لئے روسی ترکستان اور مسلم علاقوں کو کئی کئی ٹکڑوں اور پھر ہر ٹکڑے کو مزید ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا اور جو قبیلہ جہاں نظر آیا وہیں اسے ایک قوم قرار دیا گیا اور ایک قومیت و وطنیت عطا کر دی گئی۔ جس کی مقامی بولی دوسرے کی مقامی بولی سے قدرے مختلف معلوم ہوئی اس کو فوراً قومی زبان کی حیثیت ملی۔ ان مقامی بولیوں کے حروف تہجی نہیں تھے اور لوگ ترکی فارسی کو ہی اپنی علمی زبان قرار دیتے تھے، اس سے انھیں ہٹانے کے لئے قبائلی بولیوں کے حروف تہجی جلد از جلد بنائے گئے، اور رائج کئے گئے۔ یہ حروف تہجی ابتداءً میں لاطینی تھے لیکن مصطفیٰ کمال نے بھی جب عربی فارسی رسم الخط چھوڑ کر لاطینی رسم الخط ترکی زبان کے لئے استعمال کیا تو یہاں لاطینی کی جگہ سیرالک یعنی روسی حروف تہجی رائج کئے گئے، دس سال کی مختصر مدت میں پہلے تو عربی فارسی کی بجائے لاطینی رسم الخط اور اس کے بعد لاطینی کی جگہ روسی رسم الخط مسلط کیا گیا۔ رسم الخط کی اس تبدیلی کی وجہ سے جو الجھن پیدا ہوئی ہوگی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ترکستانی عوام اپنی ماضی کی تاریخ مذہب روحانیات و

۱۰۲

اخلاقیات، ماضی کے لٹریچر اور ہمسایہ مسلم ممالک سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کٹ گئے۔ اور یہی روس کا منشا تھا۔ اس سلسلہ میں اشتراکی انقلاب کے بعد ۲۷ مقامی بولیوں کو حروف تہجی دے کر باضابطہ زبانوں کے زمرے میں شامل کیا گیا۔ لیکن یہ ازبک، قازق کرغیز وغیرہ زبانیں بیکار تھیں۔ ان سے نہ تو علم دین حاصل ہو سکتا تھا نہ علم دُنیا۔ علم دین کی بعد میں ضرورت ہی نہیں رہی اور علم دنیا کے لئے روسی زبان کو اختیار کرنا پڑا۔ زار کے زمانے میں بھی روس کا لسانی سامراج ترکستانی علاقوں پر مسلط نہیں ہو سکا تھا لیکن آج سوشلزم کے پرچم تلے یہ پوری طرح مسلط ہے۔

مُسلمان اور سوشلزم

خوش فہمیوں کا پلڑا لیکر جو سوشلزم آگے بڑھا اس نے سب سے زیادہ المناک منظر وسط ایشیا کے انہی مسلم علاقوں میں پیش کیا۔ یہاں کسی کو یہ توقع تھی کہ وہ اسلام اور سوشلزم کا مرکب اسلامی سوشلزم کے نام سے پیش کر سکیں گے۔ کسی کا خیال تھا کہ زار سے چھٹکارا ملتے ہی روسی ترکستان کی علاقائیت اور قومیت کو پنپنے کے لئے سوشلزم کھلا میدان فراہم کریگا مگر یہ سب خواب چکنا چور ہو گئے۔

روسی انقلاب کے لئے ترکستان میں جو لوگ سوشلزم کے حلیف بنے یا سوشلزم کے نظریہ کو اختیار کیا انھیں ہم تین گروپوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ مذہب پرست یہ مجلس شوریٰ اسلامیہ کے نام سے کام کرتے تھے، انھیں لینن اسٹالین اور دوسرے سوشلسٹ رہنماؤں نے یقین دلایا کہ سوشلزم سے اسلام کو نقصان نہیں پہنچے گا اور ترکستان کو فائدہ ہو جائے گا۔

۲۔ جدید قومیت سے متاثرہ نوجوان۔ یہ تحریک جدیدیت یا ینگ ترکش پارٹی کے نام سے منظم تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ سوشلزم اور ترکستانیت دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔

۳۔ ترکستانی کمیونسٹ۔ انھیں اس بات کا پورا یقین تھا

کہ انقلاب کے بعد رُوس ترکستان کو ایک آزاد حلیف علاقہ مان لے گا اور اگر رُوس سے کچھ تعلق ہوگا بھی تو اس طرح کہ ترکستان صحیح و سالم ایک یونٹ کی حیثیت میں رفاق روس کا برابری اور آزادی کی بنیاد پر رکن بنے گا۔

ان تینوں گروہوں نے جو توقعات سوشلزم سے وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں لیکن اس کی ذمہ داری سوشلسٹ انقلاب یا سوشلسٹ رہنماؤں پر ہی کیوں رکھی جائے دنیا میں کوئی کسی کی غلط امیدوں اور آرزوؤں کا ذمہ دار نہیں ہے سوشلزم ایک واضح مربوط اور منظم فکر و عمل ہے جو سراسر مادہ پرستانہ ہے اور خدا مذہب کے انکار پر مبنی ہے۔ اس فکر و عمل کو جن لوگوں نے قبول کیا وہ اسے پورے کا پورا قبول کرتے یا مسترد کر دیتے اس کی بجائے جمہوریت، قومیت، علاقائیت، اشتراکیت، پان ترک ازم اور پان اسلام ازم کی ایک کھچڑی پکائی گئی اور یہ دیگ جب کھولی گئی تو ہر چیز کا دلیہ نکل آیا۔

یہ لوگ چاہتے تھے کہ ترکستان کے "تاجکستان" ازبکستان کرغزستان وغیرہ کے ناموں سے ٹکڑے نہ کئے جائیں، اسے ایک سیاسی اور تہذیبی وحدت مانا جائے۔ اس نظریہ کے حامی خود ترکستانی کمیونسٹوں میں بڑی تعداد میں تھے۔ ۱۹۱۹ء کے موسم گرما میں ترکستانی کمیونسٹوں کی کانگریس ماسکو میں ہوئی، اس میں ایک ادارہ بنایا گیا اس کا نام بیورو آف ترکستان مسلم کمیونسٹ آرگنائزیشن رکھا گیا۔ کانگریس نے قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ ازبک، قازق، کرغیز، ترکمان، باشقر، تاتار اور روس کی دوسری ترکی الاصل قومیں جو کہ قومیں نہیں قبیلے ہیں اور سوویت فیڈریشن کے اندر اپنی آزاد اور متحدہ ری پبلک قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن حکومت نے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا۔ اس تنظیم کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اور اس کے ممتاز کمیونسٹ رہنما گرفتار کئے گئے، پھر گولی سے اڑا دیئے گئے۔ رُوس کی سوشلسٹ حکومت اس ترکستانی وحدت کے تصور کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کیونکہ وہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے اصول پر عمل کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے ہر ترکستانی قبیلے کو الگ قوم اور ہر مقامی بولی کو قومی زبان قرار دیا۔

وحدت ترکستان کے حامیوں کی دلیل تھی کہ اگر سوویت حکومت جارجیائی، آرمینیائی، آذربائیجانی قومیتوں کو جو نسل زبان اور مذہب کا اختلاف رکھتی ہیں۔ ایک ٹرانس کیشیا ری پبلک کی شکل دے سکتی ہے تو ترکستان کو ایک ری پبلک کیوں نہیں بنایا جاتا۔ جبکہ یہاں نسلی، لسانی اور مذہبی اتحاد بھی پایا جاتا ہے اس کے جواب میں روسی حکومت کا جو طرز فکر تھا اس کی وضاحت روس کے وسط ایشیائی امور کے ماہر سفاروف نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سوویت فیڈریشن کے دائرہ میں ترکستان کی واحد ری پبلک ماسکو کے مقابلے میں ایک متوازی طاقت کی حیثیت اختیار کر لیتی۔ اس ری پبلک کے حامی یہ بات علانیہ کہتے تھے لیکن ان کا اصل منشاء یہی تھا اور بعد کے حالات نے ان کے اس مدعا کو واضح بھی کر دیا۔"

(نو آبادیاتی ممالک اور انقلاب، ص: ۶۳)

مسلمانوں میں سوشلزم کے حامیوں کا انجام

ایشیائی روس کے علاقوں میں جن مسلمانوں نے سوشلزم کی حمایت کی وہ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے لیکن آخرکار انھیں اس انجام سے دوچار ہونا پڑا جو غداروں کے لئے مقرر ہے۔ اس کی چند مثالیں پیش ہیں:

● سلطان غالب انقلابی تھے، کمیونسٹ تھے۔ اس بنا پر اسٹالین نے انھیں اپنا مشیر بنایا۔ قومیتوں کے کمیسار میں اونچا عہدہ دیا۔ لیکن وہ سوشلزم کے ساتھ قازق ازبک تاتاری، باشقری اور آذری ترکوں کے اتحاد اور ان کی واحد ترکستانی قومیت و ریاست کو ارتقاء دینے کے بھی قائل تھے۔ یہ تضاد رنگ لایا اور آخر کار انھیں سزائے موت دی گئی۔

● تاتاریہ کی خود مختار سوویٹ سوشلسٹ ری پبلک

کے کمیونسٹ وزیر اعظم سلطان قیلوف کو ۱۹۳۷ء میں سزائے موت دی گئی۔ ان پر الزام تھا کہ وہ پان اسلام ازم اور پان ترک ازم پھیلا رہے تھے۔ ٹراٹسکی نے اپنی کتاب "اسٹالین" میں لکھا ہے "انقلاب کے بعد سلطان قیلوف پہلے ممتاز کمیونسٹ تھے جنھیں اسٹالین کے حکم سے گرفتار کیا گیا، اور پھانسی دی گئی۔

● کریمیا کے وزیر اعظم ولی ابراھموف کو ۱۹۳۷ء میں رجعت پسندی اور بورژوا اقوام پرستی کے الزام میں موت کی سزا دی گئی۔

● باشقیر کی جمہوریہ کے صدر ظفروف اور وزیر اعظم بلاشوف کو ۱۹۳۷ء میں گولی مار دی گئی۔

● تاجکستان کے صدر نصرت اللہ مقسوم اور وزیر اعظم تاجکستان عبد الرحیم خواجیوف ۱۹۳۷ء میں علاقہ پرستانہ اور قوم پرستانہ رجحانات کی بنا پر برطرف کئے گئے۔ پارٹی سے نکالے گئے اور اپنے انجام کو پہنچے۔

● ۱۹۳۷ء میں تاجکستان کے وزیر اعظم عبد الرحیم بائوف صدر شاہ تیمور، وزیر صنعت قربانوف اور بہت سے لوگ گرفتار کئے گئے۔ وزیر تعلیم خالسوف، ان کے نائبین اور کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے تین سکریٹریوں کو بھی قوم پرستانہ پالیسی پر عمل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔

● ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۴ء کے عرصہ میں تاجکستان کے پانچ ہزار کمیونسٹوں کو موت کی سزا دی گئی۔

● ۱۹۳۸ء میں ازبکستان کے وزیر اعظم فیض اللہ اور ازبک کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی کمیٹی کے صدر اکمل اکرام کو موت کی سزا دی گئی۔ یہ دونوں چوٹی کے کمیونسٹ رہنما سمجھے جاتے تھے فیض اللہ خواجیوف کی جگہ عبد اللہ شان کریمی وزیر اعظم ہوئے انھیں پھانسی دی گئی۔ ان کی جگہ تراب بیگ اوعلو وزیر اعظم بنے انھیں بھی پھانسی ملی۔ پھر سلطان ثاقب لے وزیر اعظم بنے انھیں گولی مار دی گئی۔ ان سب پر ایک ہی الزام تھا علاقہ پرستی کا اور قومیت کا۔

● قازقستان میں سوشلزم کی بنیاد اس امید پر تھی کہ زرعی اصلاحات کے ذریعہ روسی اور یوکرینی مالکان اراضی کو اس علاقہ سے نکال باہر کرنا ممکن ہوگا۔ انقلاب کے بعد قزاقستان کی کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس نے فیصلہ دیا کہ زمینوں کی تقسیم کے معاملے میں مقامی باشندوں کو ترجیح دی جائے گی۔ حکومت کے اس فیصلے پر جھٹ عملدرآمد بھی شروع کر دیا گیا۔ سویت مرکزی حکام کو جب اسکی اطلاع ملی تو اسے انھوں نے فوراً کالعدم قرار دیا۔ مرکز نے کمیونسٹ پارٹی کے لئے نیا سکریٹری نامزد کیا اور پارٹی کی تطہیر کے بعد "علاقہ پرستوں" کو اس سے باہر نکالا گیا۔ پارٹی کی دوسری کانفرنس طلب کی گئی اس میں یہ فیصلہ منسوخ کر دیا گیا کہ زمینوں کی تقسیم میں مقامی قازق لوگوں کو ترجیح دیجائے گی اور یہ نیا فیصلہ کیا گیا کہ تقسیم اراضی میں تمام قومیتوں سے مساویانہ سلوک ہوگا۔ اور مقامی لوگوں سے ترجیحی سلوک نہیں ہوگا نہ صرف روسی اور یوکرینی اپنی اپنی اراضی پر برقرار رکھے گئے بلکہ بنجر اراضی کے زیر کاشت لائے جانے کے بعد مزید کئی لاکھ روسی اور یوکرینی یہاں آباد کئے گئے۔ اور قازقستان میں جہاں قازق اکثریت میں تھے اب وہ صرف تیس فیصد رہ گئے ہیں۔

● ازبکستان کے کمیونسٹوں اور مرکزی حکومت کے درمیان جھگڑے کی بنیاد یہ تھی کہ ازبکستان کے ممتاز کمیونسٹ کہتے تھے ہم روئی بوئیں گے اناج بوئیں گے۔ روس کے پہلے پنجسالہ منصوبہ کے لحاظ سے ازبکستان کے لئے لازم تھا کہ وہ کپاس بوئے اناج نہ بوئے لیکن مقامی لوگ کہتے تھے ہم کپاس کھا نہیں سکتے ہمیں اناج کے لئے کیوں ماسکو کا محتاج بنایا جا رہا ہے۔ اس بحث میں بڑی تلخی پیدا ہوئی اور کشت و خون میں کمیونسٹوں نے بڑے پیمانے پر مزدوروں اور کاشتکاروں کا قتل عام کیا۔

ترکستان کے آئینہ میں سوشلزم کی اس تصویر کو پیش کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم دوسروں کے بلند بانگ دعاوی کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنا سیکھیں۔ محض ذہنی مرعوبیت، جذبات کی رو میں بہہ کر یا ایمان بالغیب کی بنا پر سوشلزم کو اختیار نہ کریں ورنہ

ہمارا انجام بھی ترکستان ہی کا سا ہوگا۔

روس کے مسلم علاقے

	رقبہ مربع میل	آبادی
ترکمانیہ	ایک لاکھ ۸۸ ہزار	۱۹۔ لاکھ
تاجکستان	۵۴ ہزار	۲۴۔ لاکھ
ازبکستان	ایک لاکھ ۵۸ ہزار	۱۔کروڑ ۱۔لاکھ
کرغیزیہ	۷۶ ہزار	۲۶۔لاکھ
قازقستان	دس لاکھ ۶۴ ہزار	ایک کروڑ ۱۸۔لاکھ
آذربائیجان	۳۳ ہزار	۴۵۔ لاکھ

کل رقبہ اور آبادی: پندرہ لاکھ ۷۳ ہزار مربع میل ۳ کروڑ ۳۳ لاکھ افراد

نوٹ:

اشتراکی غلبہ سے پہلے مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن اب روسی آبادکاروں کی وجہ سے یہ اکثریت کم ہوتی جا رہی ہے۔ قازقستان میں تو مسلمان اب اقلیت میں ہو گئے ہیں۔ وہ صرف تیس فیصد رہ گئے ہیں۔

دنیا کے سب سے بڑے مسلم علاقے روس

اور چین میں ہیں

روس اور چین کے مسلم علاقے دنیا کے سب سے بڑے مسلم علاقے ہیں۔ عالم اسلام میں رقبہ کے اعتبار سے سوڈان اور الجزائر بڑے ملک ہیں۔ ان کا رقبہ نو لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے۔ لیکن روس اور چین کے مسلم علاقے رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے کتنے بڑے ہیں، ان کا دوسرے مسلمان ملکوں سے موازنہ کرنا چاہئے یہ موازنہ پیش خدمت ہے:

ملک	رقبہ (مربع میل)	آبادی
روس کا مسلم علاقہ	پندرہ لاکھ ۷۳ ہزار	تین کروڑ ۳۳ لاکھ
چین کا مسلم علاقہ (سنکیانگ)	چھ لاکھ ۳۳ ہزار	۶۰ لاکھ
پاکستان	تین لاکھ ۶۵ ہزار	دس کروڑ ۲۸ لاکھ
افغانستان	۲½ لاکھ	ایک کروڑ ۵۲ لاکھ
ایران	چھ لاکھ ۲۸ ہزار	دو کروڑ ۲۴ لاکھ
ترکی	دو لاکھ ۹۶ ہزار	تین کروڑ ۱۴ لاکھ
انڈونیشیا	سات لاکھ ۳۵ ہزار	دس کروڑ ۷۰ لاکھ
ملائشیا	ایک لاکھ ۲۸ ہزار	۹۳ لاکھ
عراق	ایک لاکھ ۷۲ ہزار	۸۲ لاکھ
شام	۷۲ ہزار	۵۴ لاکھ
مصر	تین لاکھ ۸۶ ہزار	دو کروڑ ۹۶ لاکھ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

— اقبال

سید رشید احمد ارشد ایم۔ اے۔
(لیکچرر، شعبۂ عربی۔ کراچی یونیورسٹی۔)

اسلام کا تعلیمی نظام

عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں

اسلام کے تعلیمی نظام کی اہمیت کا اندازہ لگانے سے بیشتر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کی حالت کیا تھی۔

ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کی تعلیمی زندگی کا سُراغ لگانا بے سود ہے کیونکہ اس وقت اہلِ عرب ایک ناخواندہ قوم تھے اس لئے دُوسری قوموں کے مقابلے میں عرب اُمّی یعنی ناخواندہ کہلاتے تھے، وہ عام طور سے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی کوئی مرکزی اور علمی زبان نہیں تھی عرب کے ہر قبیلے کی بولی ایک دوسرے سے جداگانہ تھی۔ اور ان کی بولیوں میں اس قدر اختلاف تھا کہ بعض اوقات ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کی بول چال کی زبان کو نہیں سمجھ سکتا تھا بالخصوص یمن اور جنوبی عرب کی زبان، شمالی عرب اور قریش کی زبان سے مختلف تھی۔

یمن کا تمدن:

حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے سینکڑوں برس پہلے سبا اور حمیری قبائل کے دور میں جنوبی عرب کا تمدن عالمِ شباب پر تھا، اس وقت یہاں کے بادشاہوں نے خطِ مسند کے نام سے ایک رسم الخط ایجاد کیا تھا جو خطِ حمیری کے نام سے بھی موسوم تھا۔ یہ خط صرف بادشاہوں اور امراء کی یادگاری جنگوں رسموں اور مخصوص احکام کو کتبوں کی شکل میں لکھنے کے لئے مستعمل رہا۔ عوام میں غالباً اس کا رواج نہیں تھا۔ کیونکہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے جو کتبات یمن کے کھنڈروں سے برآمد کئے ہیں انھیں صرف وہاں کے بادشاہوں اور امراء نے اپنے احکام جاری کرنے یا اپنے جنگی معرکوں کا اعلان کرنے کے لئے خطِ حمیری میں استعمال کیا ہے۔ کوئی عوامی کتبہ دستیاب نہیں ہو سکا اور نہ کوئی ادبی علمی یا تعلیمی قسم کی تحریر برآمد ہوئی ہے۔ البتہ مستشرقین نے ان کتبات کی مدد سے قدیم حمیری زبان کے حروفِ ابجد اور اس زبان کے الفاظ و قواعد معلوم کرلئے ہیں جو عربی لسانیات میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔

خطِ حمیری:

گمان غالب ہے کہ خطِ حمیری کے ذریعہ عرب عوام کو تعلیم دینے کی قدیم زمانہ میں کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اور نہ ایسی

کوشش ہوسکتی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں تمام دُنیا کے ممالک میں تعلیم محدود تھی اور ایک مخصوص حلقہ ہی تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔

علاوہ ازیں حمیری رسم الخط بہت ہی مشکل اور ناقابلِ فہم تھا۔ یہ صرف اینٹوں اور پتھروں میں کھود کر لکھنے کے لئے ہی کار آمد ہوسکتا تھا۔

تحریری سرمائے کا فقدان:

بہرحال اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ عربی تمدن کے اس قدیم ترین زمانے میں عربوں کا کوئی تعلیمی نظام تھا، تو بعد کے زمانے میں جب عربوں کی یہ مہذب سلطنتیں تباہ ہوگئیں تو ان کے ساتھ ساتھ ان کا تعلیمی نظام بھی ختم ہوگیا ہوگا کیونکہ اس کے بعد جزیرۂ عرب میں "عہدِ جاہلیت" کا آغاز ہوگیا تھا اور تمام ملک عرب میں ناخواندگی اور جہالت مسلط ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ اسلام سے قبل ان کے کسی تحریری سرمائے کا سراغ نہیں ملتا۔

مکۂ معظمہ کی مرکزیت:

موجودہ قدیم روایات سے جو ثابت ہوا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے نصف صدی پیشتر مکۂ معظمہ کو خانۂ کعبہ کی وجہ سے ایک طرح کی مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، اور وہاں مختلف میلے اور بازار لگنے شروع ہو گئے تھے۔ ان میلوں اور بازاروں کے لگنے سے مختلف قبائل کے شعرا بھی یہاں آنے لگے اور عکاظ کے مقام پر عرب شعرا کا اجتماع ہونے لگا اور وہ عوام و خواص کو اپنے قصائد سُنانے لگے۔

یہ شعراء ایسی زبان میں اشعار سناتے تھے جسے سب لوگ سمجھتے تھے۔ ایسی زبان قریش کی زبان تھی جس میں شعراء اپنے اشعار سُناتے تھے۔ اس طرح ظہور اسلام سے قبل قریش کی زبان کو ایک قسم کی مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔

قریش کی زبان:

قبیلہ قریش کی زبان کو تمام عرب قبائل کے شعراء اس لئے پسند کرتے تھے کہ ان کی زبان کو تمام قبائل جو حج کے موقع پر جمع ہوتے تھے، سمجھنے لگے تھے۔ اہل قریش بھی تجارت کے لئے ان تمام مشہور قبائل کے ہاں سلسلۂ آمد و رفت رکھتے تھے لہٰذا تجارتی تعلقات کی وجہ سے بھی اکثر اہل عرب، قبیلۂ قریش کی زبان کو سمجھنے لگے تھے۔ اس طرح اسے ایسی بنیادی مقبولیت حاصل ہوئی جس کی بنا پر آگے چل کر وہ مرکزی زبان کی حیثیت اختیار کر سکتی تھی۔

علم کی فضیلت:

اسلام میں تعلیم اور علم کی فضیلت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی اور غارِ حرا میں آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو اس میں سب سے پہلے آپ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور سورہ اقرا میں پہلی وحی کی جو آیات نازل ہوئیں ان میں نوشت و خواند کی تلقین کی گئی تھی۔ اور قلم کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کی فضیلت کا اعتراف کیا گیا۔ چنانچہ اس پہلی وحی کو اسلامی نظام تعلیم کا سنگِ بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔

تعلیم و تبلیغ کا آغاز:

اس کے بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ پیغام خداوندی اپنے رشتہ داروں اور دیگر اہل مکہ تک پہنچا دیں اور انھیں قرآن کریم کے احکام سنائیں اس طرح یہ مذہبی تبلیغ عربوں کے لئے تعلیمی درسگاہ بن گئی اور آپ کوچہ و بازار میں ہر جگہ تعلیم و تبلیغ کے فرائض انجام دینے لگے۔ آپ کفار مکہ کو بھی اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ تاہم وہ لوگ جو مسلمان ہو گئے تھے، آپ کی تعلیمات سے خاص طور پر مستفید ہوئے۔

آپ انھیں نہ صرف اخلاقی اور مذہبی تعلیم دیتے تھے بلکہ ان کی علمی تربیت بھی کرتے تھے۔ یہ مسلمان قرآن کریم کی آیات اور سورتیں یاد کر کے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی اور علمی قابلیت بھی بڑھاتے تھے۔

قرآن کریم کے اثرات:

چونکہ قرآن کریم کی زبان نہایت فصیح و بلیغ تھی اس لئے تمام مسلمانوں کا لہجہ نہایت عمدہ ہو گیا۔ اور ان کی زبان یکساں ہو گئی۔ اور ان کی بول چال اور گفتگو بھی شائستہ اور فصیح ہو گئی۔ اور ان کا کلام بدویانہ بول چال کے دائرہ سے نکل کر ایک مہذب اور متمدن قوم کی گفتگو میں تبدیل ہو گیا یہاں تک کہ قرآن کریم کی تعلیم کی بدولت عہدِ رسالت کے آخری زمانے میں عربی زبان ایک فصیح و بلیغ مرکزی زبان کی حیثیت سے تمام عرب میں مقبول ہو گئی اور ان کی قبائلی بولیوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اور یہ سب کچھ قرآن کریم کی تعلیم و اشاعت کی بدولت تھا۔

انقلابی نتائج:

لہٰذا یہ خیال کرنا کہ قرآن کریم کی تعلیم صرف مذہبی تعلیم تھی، صحیح نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ نہ صرف مسلمانوں کی خواندگی کا معیار بڑھا بلکہ انھوں نے تہذیب اور مدنیت کے وہ تمام اچھے اصول سیکھے جو عام طور پر موجودہ درس گاہوں میں سکھائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ادبی اور علمی حیثیت سے ان کی قابلیت اور صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور تعلیم قرآن سے ان کا اندازِ خطابت بھی ترقی پذیر ہوا۔ اس طرح وہ آگے چل کر فصیح و بلیغ مقرر، خطیب، بہادر جرنیل، اور بے نظیر مدبّر و سیاست داں ثابت ہوئے۔

معلمِ اوّل:

اس طرح مسلمانوں کے لئے قرآن کریم سرچشمۂ علوم بنا۔ ان کے معلم اوّل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ قرآن کریم کے ذریعہ انھیں اخلاق اور آدابِ معاشرت و تمدن کی تعلیم دی گئی اور یہی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ بھی تھا۔ اور اسی کے ذریعہ انھوں نے نوشت و خواند کی قابلیت میں بھی اضافہ کیا بلکہ قرآن کریم نے مسلمانوں میں بالعموم اور عربوں میں بالخصوص لسانی، قومی اور سیاسی اور مذہبی اتحاد و تنظیم پیدا کی۔

تعلیم کی وسعت:

مکی زندگی میں مسلمانوں کی حالت کمزور تھی اس لئے وہاں تعلیم کا وہ نظام تو قائم نہ ہو سکا جو مدینۂ طیبہ میں قائم ہوا۔ تاہم آپ کا ہر صحابی بیک وقت معلم بھی تھا اور مبلغ بھی کیونکہ اسلامی تبلیغ تعلیم کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے ہر مسلمان اپنے نئے ساتھیوں کو قرآن کریم اور اسلام کی تعلیم دیتا تھا۔

معلم مدینہ:

ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ کے کچھ باشندے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکۂ معظمہ آ کر مسلمان ہو گئے تھے انھوں نے آپ سے درخواست کی کہ مدینہ کے مسلمان باشندوں کو اسلام کی تعلیم دینے کے لئے کوئی معلم بھیجا جائے لہٰذا آپ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو جو قدیم مسلمانوں میں سے تھے مدینۂ منورہ بھیجا۔ چنانچہ ان کی تعلیمات کی بدولت اسلام مدینہ کے گھر گھر پھیل گیا۔ اور انھی کی تعلیم کی بدولت قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ مسلمان ہو گئے۔

حضرت مصعب بن عمیر پہلے مسلمان تھے جو مکہ معظمہ سے باہر معلم کی حیثیت سے بھیجے گئے تھے اور وہ اپنے تعلیمی مشن میں کامیاب ہوئے۔

عام اور لازمی تعلیم:

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینۂ منورہ تشریف لائے اور یہاں آ کر آپ نے خود مختار اسلامی مملکت قائم فرمائی تو اس کے ساتھ ساتھ آپ نے بہتر نظام تعلیم قائم کیا۔

اس نظام تعلیم میں سب سے مقدم اور اہم قرآن کریم کی تعلیم تھی جو مدینہ منورہ کے ہر مرد و زن کے لئے لازمی تھی۔ بچے بوڑھے سب قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس تعلیمی نظام کی نگہبانی آپ بذاتِ خود کرتے تھے اور قرآن کریم کے احکام کی وضاحت کے سلسلے میں جس کسی کو کوئی دقت پیش آتی تھی تو وہ براہ راست آ کر آپ سے اپنی مشکلات کو رفع کرتا تھا۔

تعلیمی نظام:

چونکہ مہاجرین مدینۂ منورہ آکر آباد ہو گئے تھے اس لئے مدینہ کی آبادی وسیع ہو گئی تھی اور بعض مہاجرین مدینہ کے اصل شہر سے کچھ دور مضافات میں رہنے لگے تھے۔ مدینہ کے مرد روزانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر آپؐ کی تعلیمات سے مستفید ہوتے تھے۔ اور ضروری احکام معلوم کر لیتے تھے مگر وہ لوگ، جو شہر سے دور مضافات میں رہتے تھے وہ ایک دن بیچ آتے تھے یعنی ان کا ایک ساتھی ایک دن آتا تھا اور دوسرا ساتھی دوسرے دن۔ اس طرح ہر ایک کو ساتھی کے ذریعہ روزمرّہ کی تعلیمات اور احکام معلوم ہو جاتے تھے۔

ایسے لوگوں میں حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ بھی تھے وہ بھی شہر سے باہر رہتے تھے اس لئے انھوں نے ایک انصار پڑوسی سے یہ معاملہ طے کر رکھا تھا کہ ایک دن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرے اور دوسرے دن وہ خود آنحضرت کی خدمت میں تعلیمات حاصل کرنے کے لئے جائیں اور اس طرح وہ ایک دوسرے کو آنحضرت کی تعلیمات سے آگاہ کرتے رہیں۔

اصحابِ صفّہ:

مدینۂ منورہ میں صحابہ کی ایک قلیل تعداد ایسی بھی جن کا کوئی گھر بار نہیں تھا اور اپنی مفلسی کی وجہ سے وہ تجارت و زراعت میں مشغول نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا وہ شب و روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ اور مسجدِ نبوی میں ایک چبوترے پر رہتے تھے اسلئے وہ اصحابِ صفہ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر وقت رہنے کی وجہ سے آپؐ کی تعلیمات سے زیادہ مستفید ہوتے اور آگے چل کر معلم کے فرائض انجام دینے کے قابل ہوئے۔ انھی میں حضرت ابوہریرہؓ بھی تھے جو احادیثِ نبویؐ کے سب سے بڑے راوی اور عالم تھے۔ چنانچہ انھوں نے تنگ دستی اور فاقہ کشی کے باوجود سب سے زیادہ احادیثِ نبویؐ کو یاد رکھا اور اس کے بعد ہزاروں انسانوں کو احادیث نبویؐ کی تعلیم دی چنانچہ ان کا یہ فیض تعلیم اب تک جاری ہے۔

دیگر مہاجرین و انصار:

اس قلیل تعداد کے علاوہ اکثر مہاجرین و انصار اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے تھے۔ انصار پہلے ہی سے مدینہ میں کاشتکاری کے فرائض انجام دیتے تھے اس لئے وہ اسی کام میں لگے رہے۔ البتہ شروع میں مہاجرین کا مدینۂ طیبہ میں کوئی وسیلۂ معاش نہ تھا تاہم اہلِ مدینہ کے تعاون اور بھائی چارہ کی بدولت وہ جلد ہی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ چونکہ انھیں تجارتی کاروبار کا تجربہ تھا اس لئے یہ حضرات تجارت میں مشغول ہو گئے۔

تعلیم بالغان:

تاہم تجارت و زراعت کے کاروبار میں مشغول ہونے کے باوجود یہ حضرات تعلیم سے غافل نہیں رہے بلکہ فرصت کے اوقات میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روزانہ حاضر ہوتے تھے اور آپؐ کی تعلیمات سے مستفید ہوتے تھے روزمرہ کی اہم تعلیمات آپؐ خود دیتے تھے۔ اور قرآن کریم کی تعلیم لوگ دیگر اکابر صحابہؓ سے حاصل کرتے تھے۔ اس طرح تعلیم بالغان کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

آپؐ کا طریقۂ تعلیم:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تعلیم نفسیاتی اعتبار سے بڑا موثر تھا۔ آپؐ نہایت آسان اور دلنشیں انداز میں لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ضروری باتیں آپؐ تین دفعہ دہراتے تھے تاکہ ایک کند ذہن انسان بھی انھیں اچھی طرح سمجھ سکے۔ آپؐ ہر شخص کو اس کی صلاحیت اور عقل و مزاج کے مطابق تعلیم دیتے تھے بلکہ آپ بار بار معلموں کو یہ ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ:

"تم لوگوں سے ان کی عقل (ذہنیت) کے مطابق گفتگو کیا کرو۔"

اسی اصول کے مطابق آپ نہایت آسان زبان میں مختصر گفتگو فرماتے تھے اور غیر متعلقہ باتوں کو درمیان میں نہیں لاتے تھے البتہ سمجھانے کے لئے ضروری اور اہم باتوں کی تکرار فرماتے تھے۔ آپؐ کی محفل میں جاہل اور اکھڑ عرب بدو اکثر آیا کرتے تھے اور وہ اکثر آداب محفل کا لحاظ کئے بغیر ناشائستہ طور پر گفتگو کرتے تھے اور بے ڈھنگے سوالات کرتے تھے، مگر آپؐ ان کے سوالات کو نہایت تحمل اور ٹھنڈے دل سے سنتے تھے اور ان کے مزاج اور ذہنیت کے مطابق تسلی بخش جواب دیتے تھے۔ جس سے وہ مطمئن ہو جاتے تھے۔

معلمین کا انتظام:

مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد آپؐ حسب ضرورت بیرونی علاقوں کے قبائل کو قرآن کریم کی تعلیم دینے کے لئے معلمین بھیجتے تھے۔ جنھیں قرّا کہا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب عرب قبائل جوق در جوق مسلمان ہونے لگے تو ان کے وفد مدینہ میں آکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور یہاں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس جاتے تھے۔ اور وہاں اپنے قبائل کو اسلامی تعلیم دیتے تھے۔

جب اہل یمن مسلمان ہو گئے تو آپؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت علیؓ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا کہ انھیں تعلیم دیں۔ وہاں یہ لوگ حکومت کے فرائض کے ساتھ اسلام کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اس طرح آپؐ نے ہر حاکم کے فرائض میں تعلیم کو بھی شامل کیا چنانچہ بعد میں تمام حکام اور کمانڈر اسلام کے مبلغ اور معلم بھی ہوا کرتے تھے۔

عہد فاروقی کا نظام تعلیم:

یہ امر تعجب خیز ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، نے اپنے زمانے میں ذرائع آمد و رفت کی دشواریوں، قوموں کی بے حد جہالت، طباعت اور کتابت کا انتظام نہ ہونے کے باوجود ایک ایسا وسیع نظام تعلیم قائم کر لیا تھا جو موجودہ زمانے میں مذکورہ بالا سہولتوں کے باوجود مشکل نظر آرہا ہے آپ نے نہ صرف بچوں کے لئے مکاتب قائم کئے تھے بلکہ بالغوں کی تعلیم کا بھی مناسب بندوبست کر رکھا تھا۔

لازمی تعلیم کا انتظام:

اس تعلیم میں قرآن کریم کی تعلیم کو زیادہ اہمیت حاصل تھی کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم دینی اور دُنیاوی ترقیوں کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ اور اس کی تعلیم کے بعد وہ دیگر علوم سے بے نیاز ہو جاتے تھے اس بنا پر اسلامی تعلیم ہر مسلمان کے لئے لازمی تھی اور اسی تعلیم میں انھیں نوشت و خواند جسمانی اور فوجی تعلیم بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ خانہ بدوش بدو بھی تعلیم حاصل کرنے سے مستثنیٰ نہ تھے مگر چونکہ اس قسم کے لوگوں کو جن کی بود و باش نہ ہو، تعلیم دینا اور ان کی تعلیمی قابلیت کو جانچنا بڑا مشکل کام تھا اس بنا پر حضرت فاروق اعظمؓ نے مناسب انتظام سے ان مشکلات کو رفع کیا انھوں نے بدوؤں اور اعرابیوں کی تعلیم کو جانچنے اور ان کا امتحان لینے کے لئے چند تعلیمی انسپکٹر مقرر کر رکھے تھے۔ جو حضرت ابو سفیانؓ کی زیر سرکردگی ان خانہ بدوش قبائل میں گشت لگا کر ان لوگوں کا امتحان لیتے تھے اور انھیں خلافت فاروقی کی طرف سے یہ اختیارات بھی حاصل تھے کہ جس شخص کو قرآن کریم کا کوئی حصہ یاد نہ ہو یا وہ تعلیم حاصل کرنے سے پہلو تہی کرتے ہوں تو انھیں مناسب سزا دیں۔

نصاب تعلیم:

بچوں کے ۔۔ مکاتب میں قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ نوشت و خواند کی تعلیم بھی دی جاتی تھی یعنی لکھنا اور عربی ادب و زبان کی تعلیم بھی لازمی رکھی گئی تھی۔ تاکہ قرآن کریم کے اعراب اور الفاظ میں بچے غلطی نہ کر سکیں لیکن ان مکاتب میں صرف قرآن کریم کی عبارت پڑھانے پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین و احکام کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ بعض دفعہ فقہ اور اسلامی مسائل کی تعلیم کے لئے الگ الگ معلم مقرر ہوتے تھے لیکن وہ جلیل القدر صحابہؓ جو قرآن کریم حدیث اور فقہ تینوں کے

ماہر ہوتے تھے۔ ہر قسم کی اسلامی تعلیم دے سکتے تھے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی اسی قسم کے معلم تھے۔ اور ان کا حلقۂ درس جامع مسجد دمشق میں بہت وسیع تھا۔

معلمّ کے اوصاف:

چھوٹے چھوٹے بچوں کے معلمین کے انتخاب میں کافی جد و جہد کی جاتی تھی۔ اور وہ خوش الحان قاری اور حافظ ہونے کے علاوہ لغت اور زبان کے جیّد عالم ہوتے تھے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ حکم صادر فرما رکھا تھا کہ کوئی زبانِ عربی کا عالم نہ ہو وہ قرآن کریم کی تعلیم دینے کا اہل نہیں ہو سکتا۔

چھوٹے بچوں کے مکاتب میں تعلیم دینے والے اساتذہ کے وظائف پندرہ پندرہ درہم ہوتے تھے۔ اس سے پیشتر مسلمان تعلیم کی اُجرت نہیں لیتے تھے۔ اور مفت پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ باقاعدہ وسیع نظام تعلیم ہر قریہ اور ہر شہر میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے جب تک کثیر تعداد معلموں کو محض اس کام کے لئے وقف نہ کیا جاتا اس وقت تک یہ سلسلہ قائم نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے ان کے لئے وظائف مقرر کرنے ضروری تھے تاکہ وہ حصولِ معاش کی فکر سے آزاد رہیں۔

فوجیوں کی تعلیم:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تعلیم میں اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ وہ اپنے گورنروں اور عمال کے نام جو احکام جاری فرماتے تھے۔ ان میں تعلیم قرآن کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ چونکہ فوجیوں کے لئے بھی تعلیم قرآن لازمی رکھی گئی تھی اس لئے اہلِ فوج کی قرآن خوانی سے متعلق ہر مقام پر ایک باقاعدہ رجسٹر ہوتا تھا جس میں انکی تعلیمی ترقی کی کیفیت مندرج ہوتی تھی ان میں تعلیم کا مزید شوق پیدا کرنے لئے تعلیمی ترقی پر انھیں وظائف بھی دئے جاتے تھے۔ اس قسم کے رجسٹروں کو خلیفۂ اعظم وقتاً فوقتاً دربار خلافت میں طلب فرماتے تھے۔ تاکہ ان کی تعلیمی ترقی کا اندازہ ہو سکے۔ اس نگرانی سے اہل فوج میں قرآن کی تعلیم اس قدر عام ہوگئی تھی کہ نہ صرف ناظرہ خوانوں کی تعداد بڑھ گئی کہ اس کا کوئی شمار نہ تھا بلکہ حافظوں کی تعداد میں بھی اس قدر اضافہ ہوا کہ عراق کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے لشکر میں (جبکہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا ابھی آغاز تھا) تین سو مسلمان حافظِ قرآن ہو گئے تھے۔ ان حافظوں کو حضرت عمرؓ طلب فرما کر مختلف دیہاتی اور قصباتی علاقوں میں تعلیم قرآن کے واسطے بھیجا کرتے تھے۔ اور جس قدر تعلیم عام ہوتی گئی اسی قدر قابل معلم اور استاد دور دراز علاقوں میں نومسلموں کو تعلیم دینے کے لئے بھیجے جاتے رہے۔

قابل معلمین اسلام:

تعلیمی کاموں میں لائق اور فاضل اساتذہ کا انتخاب فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اہم خصوصیت تھی۔ باقاعدہ معلمین کے علاوہ اسلام کے فوجی جرنیل، سپہ سالار اور گورنر بھی معلم کے فرائض انجام دیتے تھے بلکہ یوں کہئے کہ اسلام کا ہر آدمی سپاہی بھی تھا اور معلم و مبلغ بھی تھا یہی وجہ ہے کہ ہمیں عہد فاروقی کے قابل معلمین کی فہرست میں ان لوگوں کے اسمار گرامی بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے ساری زندگی جنگوں میں گذاری تھی اور جو بقول اقبال مرحوم تیغوں کے سائے میں پل کر جوان ہوئے تھے۔

شام کے تعلیمی افسر:

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم سے مندرجہ ذیل جلیل القدر ہستیوں کی ایک مجلس بنائی گئی اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ شام کے مختلف علاقوں میں اپنے تعلیمی مراکز قائم کریں۔ وہ صحابہ یہ تھے: حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبادۃ بن صامتؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ یہ تینوں حضرات سب سے پہلے حمص پہنچے اور وہاں اسلامی تعلیمات کی بیخ و بن کو مضبوط کیا جب یہ تعلیمی مرکز مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگیا تو اس مرکز کے نگراں حضرت عبادۃ بن صامتؓ مقرر ہوئے اور حضرت معاذ بن جبلؓ جو ایک دفعہ شام کے اسلامی لشکر کے کمانڈر انچیف

اور حاکم اعلیٰ بھی مقرر ہوئے تھے، فلسطین کی سرزمین کے تعلیمی مرکز کے نگراں ہو گئے۔ عہد رسالت کے مشہور قاری اور زبردست محدث حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ شام کے پایۂ تخت دمشق میں تعلیمات کے معلم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ اور آپ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری زمانہ تک نوجوانانِ اسلام کو اپنے حلقۂ درس سے مستفید فرماتے رہے۔

طریقۂ تعلیم:

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ آپ نماز فجر کے بعد ہی درس قرآن کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے چونکہ طلباء کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لئے آپ نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ دس دس مبتدی طالب علموں کی ایک جماعت کے لئے محنتی اور فارغ التحصیل طالب علموں میں سے ایک مانیٹر مقرر کر رکھا تھا اور بذاتِ خود سب جماعتوں کی اس طرح نگرانی فرماتے تھے کہ ٹہلتے جاتے اور پڑھنے والوں پر کان لگائے رکھتے تھے تاکہ درس وتدریس کا سلسلہ باقاعدہ اور صحیح طریقہ سے انجام پاتا رہے۔ جب کوئی طالب علم پورا قرآن کریم یاد کر لیتا تو وہ خاص ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی شاگردی میں آجاتا تھا۔ اور اسے باقی ماندہ ضروری تعلیم دی جاتی تھی۔ آپ کا حلقۂ درس اس قدر وسیع تھا کہ جب ایک دن آپ نے طالب علموں کا شمار کرایا تو معلوم ہوا کہ صرف آپ کے حلقۂ درس میں سولہ سو طالب العلم تعلیم پا رہے تھے،

یہ طریقۂ تعلیم قرآن کے لئے تھا، مگر اسلامی تعلیمات اور قوانین فقہیہ کی تعلیم کا طریقہ جدا تھا۔ ان فقہائے اسلام کے حلقۂ درس میں لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ بعض وقت تیس صحابی بیک وقت تعلیمی خدمات انجام دیتے تھے۔ تعلیم فقہ کا تعلق صرف نوعمر طلباء اور دیگر شائقین علم کے ساتھ نہ تھا بلکہ عوام الناس بھی ان مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں کتابی طریقۂ تعلیم اختیار نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایسی مجالس میں فقہائے اسلام کے گرد شائقین علم دائرہ کی شکل میں بیٹھ جاتے تھے۔ اور ہر شخص کو اپنے حالات کے مطابق سوالات کرنے کا موقع دیا جاتا تھا چنانچہ ہر ایک باری باری مسائل دریافت کرتا تھا اور یہ فقہاء دلنشیں پیرایے میں نہایت شافی اور تسلی بخش جوابات دیتے تھے۔ اس طرح ہر شخص کو اپنی معلومات بڑھانے، مختلف جوابات سے فائدہ اٹھانے اور شکوک رفع کرنے کا موقع ملتا تھا۔

اسلامی تعلیم کے نتائج:

یہی وہ طریقہ ہے جسے آج کل ماہرین تعلیم بہت پسند کرتے ہیں۔ اس طرح سے طالبان علم میں علمی تحقیق وتجسس کا مادہ پیدا ہوتا ہے جو آگے چل کر کائنات عالم کے سربستہ رازوں پر منکشف کر دیتا ہے اور اسی تحقیقی جذبہ سے بعد کے زمانے میں مسلمانوں میں فلسفہ اور سائنس کا شوق پیدا ہوا اور وہ دنیا کے موجودہ علوم وفنون کے بانی ہوئے۔

بقیہ "دل کی دنیا"

محبت الٰہی کے حصول کا تیسرا طریقہ "ذکر لسانی" ہے انسان اگر کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا کرے تو رفتہ رفتہ اللہ کی محبت دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ "ذکر" کے دوران اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ذہن اور دل زیادہ سے زیادہ "ذکر" ہی کی طرف متوجہ رہے۔ دوسرے خیالات میں نہ الجھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں کہ طریق سلوک میں جمعیتِ خاطر رکھنا اور مشوشات سے دل کو پاک رکھنا ضروری ہے۔ غیر اختیاری افکار میں تو مضائقہ نہیں لیکن بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ غیر ضروری افکار دل کا ستیاناس کر دیتے ہیں"!

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مقام محبت کے حصول کا اصل طریقہ کسی اہل اللہ بزرگ کی طویل صحبت ہے، اپنے آپ کو کسی مرشدِ کامل کے حوالہ کئے بغیر عموماً یہ مقام حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ان مقامات کو حاصل کرنے کے طریقے مختلف لوگوں کے اختلافِ طبائع کی مناسبت سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور انہیں کوئی شیخ کامل ہی پہچان سکتا ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اور تحریکِ پاکستان

احمد سعید
ایم اے تاریخ - ایم اے پولیٹیکل سائنس
لیکچرر ایم اے او کالج - لاہور

تحریکِ پاکستان اور علمائے کرام کے ضمن میں اپنے گزشتہ مضمون میں عرض کر چکا ہوں کہ علماء کیخلاف خصوصاً علمائے دیوبند کے متعلق کسی حد تک غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ علمائے دیوبند کے ایک گروپ نے جس زور شور سے تحریکِ پاکستان میں کام کیا اس کی ایک جداگانہ تاریخی حیثیت ہے لیکن ابھی تک اس موضوع پر وسیع پیمانے پر کام نہیں ہو سکا۔ ایک تو مواد کی کمی دوسرے ان حضرات کے عدم تعاون کا مسئلہ جنھوں نے تحریک میں کام کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب جو کتابیں تحریکِ پاکستان کے متعلق لکھی گئیں، ان میں علماء کا تذکرہ ضمناً کیا جا رہا ہے مثلاً ایک کتاب The Deoband School and the Demand for Pak (مطالبۂ پاکستان اور علمائے دیوبند) اکیسوا اڑتالیس صفحے کی اس کتاب میں یہ بات ثابت کرنیکی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت میں دیوبند اسکول نے بہت حصّہ لیا اور سارا دیوبند تحریکِ پاکستان کے خلاف تھا۔ کتاب میں صرف دو صفحات ۱۰۳، اور ۱۱۹ پر مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی کا صرف چار لائینوں میں ذکر ہے۔ اسی طرح "پاکستان ناگزیر تھا" از سید حسن ریاض، میں بھی صرف ۲۴ لائنوں میں مسلم لیگ اور علماء کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کی کل ضخامت ۵۶۷ صفحے ہے۔

تحریکِ پاکستان میں جو رول مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ادا کیا وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ مولانا نے اپنی زندگی کے آخری ایام پاکستان کے لئے وقف کر دیے تھے۔

دو قومی نظریہ:

مولانا عثمانی نے بڑے شد و مد کے ساتھ ان علماء کی تردید کی جو متحدہ قومیت کے حامی تھے۔ فرمایا: "ہندوستان میں جو سیاسی کشمکش اس وقت جاری ہے میرے نزدیک اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تنفر بلکہ اشتعال انگیز جھوٹ اور سب سے بڑی اہانت آمیز دیدہ دلیری یہ ہے کہ یہاں کے دس کروڑ فرزندانِ اسلام کی مستقل قومیت کا انکار کر دیا جائے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ غلط یا صحیح طور پر دُنیا کی اقوام کی تقسیم وطن، نسل، زبان اور طرزِ تمدن

وغیرہ کے لحاظ سے ہوتی رہی ہے اور اب بھی موجود ہے لیکن خاتم الانبیاء کی تشریف آوری سے دُنیا کی جو تعمیرِ جدید ہوئی اس میں تخلیق کے اعلیٰ ترین مقاصد کے پیش اللہ کے پیدا کئے ہوئے تمام انسانوں کی باعتبارِ قومیت کے ایسی ثنائی تقسیم کردی گئی جس کے احاطہ سے کوئی فردِ بشر باہر نہ رہ سکے اب اسلامی نقطۂ نظر سے گویا روئے زمین پر دُو قومیں آباد ہیں۔ ایک وہ جس نے فاطرِ ہستی کی صحیح معرفت حاصل کر کے اس کے مکمل اور آخری قانون کو اس کی زمین پر رائج کرنے کا التزام کرلیا ہے وہ مسلم یا مومن ہے' دوسری وہ جس نے اپنے اوپر ایسا التزام نہیں کیا اس کا شرعی نام کافر ہوا"[1]

ایک خط میں فرمایا:

" قومیتِ متحدہ کا نظریہ جو کانگریس کے دستورِ اساسی کا بنیادی پتھر ہے۔ اس معنی میں جو کانگریس کے ائمہ اس سے ارادے کرتے ہیں میرے نزدیک شرعی نقطۂ نظر سے کبھی قابلِ تسلیم نہیں ہوسکتا۔

میں کوئی سیاسی آدمی نہیں نہ سیاست میں کوئی خاص اشتغال رکھتا ہوں تاہم اپنی قوم کے سود وبہبود کو سوچنا اس کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے میرے لئے ناگزیر ہے جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے لئے سب سے پہلے ایک خالص اسلامی وحدت ومرکزیت پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بدون کسی نام نہاد قومیتِ متحدہ کے تیز رو دھارے میں گھاس کے تنکوں کی طرح اپنے کو ڈال دینا خودکشی کے مترادف ہے۔ مسلمان دوسری قوموں سے صلح کرسکتے ہیں' عہد وپیمان کرسکتے ہیں' بہت سے امور میں تعاون اور اشتراکِ عمل کرسکتے ہیں لیکن وہ اپنی مستقل ہستی کو دوسروں میں مدغم نہیں کرسکتے"۔[2]

اپنے ایک اور بیان میں فرمایا:

"نہ میں کوئی مفتی ہوں نہ ماہرِ سیاست' ہاں اسلامی برادری کا ایک ادنیٰ جزو ہونے کی حیثیت سے اپنے اندازہ علم وفہم کے موافق سوچ سمجھ کر جو رائے قائم ہوئی ہے اپنے مخلصین کے پیہم اصرار پر بطورِ مشورہ عرض کردیتا ہوں۔ بہت چاہتا تھا کہ خاموش رہوں لیکن کچھ تو لوگ خاموش نہیں رہنے دیتے کچھ اس وقت یہ دردناک منظر دیکھ کر کہ دس کروڑ مسلمانوں کی قومی اور سیاسی استقلال کی رُوح کو کیسی سنگ دلی سے مسلمانوں ہی کی چھری سے ذبح کرایا جارہا ہے بالکل خاموش رہنا گوارا نہ کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا مقصد اپنے پیروؤں کے ذریعہ ایک ایسی قومیت کی تشکیل کرنا ہے جو وطن نسل' رنگ' پیشہ' زبان اور مختلف اقوام کی قائم کردہ معاشرتی اور تمدنی خصائص سے بالاتر ہو"۔[3]

مسلم لیگ اور مولانا عثمانی:

مولانا شبیر احمد نے اپنی تقاریر میں مسلمانوں کے لئے لازم قرار دیا کہ وہ مسلمانوں کی قومی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں۔ اپنے پیغام بنام جمعیۃ علماءِ اسلام کلکتہ میں فرماتے ہیں:

"میں زمانہ دراز تک ان مسائل کے اطراف وجوانب پر غور کرتا رہا ہوں آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس وقت مسلمانوں کو حصولِ پاکستان کی خاطر مسلم لیگ کی تائید وحمایت میں حدودِ شرعیہ کی رعایت کے ساتھ حصہ لینا چاہیئے۔ میں یہ گمان کرتا ہوں کہ اگر اس وقت مسلم لیگ ناکام ہوگئی تو پھر شاید مدّتِ دراز تک مسلمانوں کو اس ملک میں پنپنے کا موقع نہ ملے گا۔ اس لئے وقت کی ضرورت ہے کہ مسلمان مسلم لیگ کے بازو مضبوط کریں"۔[4]

پاکستان اور مولانا عثمانی:

---

[1] شبیر احمد عثمانی۔ پیغام شیخ الاسلام۔ ہاشمی بکڈپو لاہور ص ۱۳-۱۲

[2] طلوعِ اسلام۔ دہلی۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء ص ۲۳-۲۲

[3] پیغام شیخ الاسلام۔ ص: ۳۵-۳۶ [4] پیغام شیخ الاسلام۔ ص: ۲۲

چاہتے ہیں اور یہ کہ ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا حل صرف پاکستان ہے اور یہ اس برصغیر کی دو خود مختار دولتوں کے لئے خوشی فلاح اور تحفظ کا باعث ہوگا۔" [۱۳]

جب یہ وفد ہندوستان پہنچا تو مولانا عثمانی نے ایک تار روانہ کیا۔ جس میں مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان پر زور دیا اور کابینہ مشن کو متنبہ کیا کہ اگر مسلم لیگ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتائج بہت برے ثابت ہوں گے مولانا نے اپنے تار میں لکھا:

"پاکستان ہماری قوم کا کم سے کم مطالبہ ہے۔ ہر دو اقوام ہند کے مراکز اقتدار و حکومت خود اختیاری الگ الگ اور جدا گانہ ہوں۔ مسلم لیگ کو نظر انداز کرنا پوری مسلم قوم کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ اس تاریخی قوم کے برانگیختہ جذبات کو سخت آزمائش و ابتلاء میں کرنے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ایسے خوفناک نتائج پیدا نہ ہوں جو سب کے لئے ناخوشگوار اور نقصان دہ ہوں۔ ہندوستان کے ایک اہم حصہ کو معطل کر کے کابینہ مشن اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔" [۱۴]

سرحد ریفرنڈم

سرحد اور سلہٹ کے علاقے قائد اعظم کے نزدیک ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ قائد اعظم نے مولانا عثمانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی کے سامنے ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو اپنی تشویش کا اظہار کیا۔[۱۵] چنانچہ مولانا شبیر احمد نے وعدہ کیا کہ وہ سرحد کے علاقے میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے کوشش کریں گے۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرحد کا دورہ کیا اور مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے راہ ہموار کی۔

پشاور میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"مسلم لیگ اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک یہ نظام دنیا قائم ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو بہار گڈھ مکیشر کے واقعات سے ختم کیا جا سکتا ہے تو وہ بیوقوف ہے۔ احمق ہے۔ مسلم قوم اس سے بھی زیادہ طوفان انگیز انقلابوں کو گذر چکی ہے اور اس قسم کی بیسیوں خون آشام جنگوں سے کامران و سرخرو ہو کر نکل چکی ہے۔ یہ قوم اتنی ہی طاقتور ہوئی جتنا اسکو کچلا گیا۔"

خان عبد الغفار خاں کے متعلق فرمایا:

"اگر خان برادر اپنے عقیدہ میں مخلص ہیں اور صوبہ سرحد میں اسلامی شریعت کے مطابق جمہوری حکومت کے قیام کے متمنی ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں کیونکہ اس طرح وہ پاکستان کو زیادہ مضبوط اور طاقتور بنا سکتے ہیں۔" [۱۶]

خدا کے فضل و کرم سے مسلم لیگ کامیاب ہوئی اور جب مولانا شبیر احمد نے مسلم لیگ کی کامیابی پر قائد اعظم کو مبارکباد دی تو انھوں نے جواب میں فرمایا "مولانا اس مبارک باد کے مستحق تو آپ ہیں یہ ساری کامیابی علماء کی بدولت ہوئی۔" [۱۷]

مولانا شبیر احمد کے بارے میں مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا "مرحوم نوابزادہ لیاقت علیخان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم کسی بڑے مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانی سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔" [۱۸]

پاکستان سے محبت:

لاہور میں جمعیۃ علمائے اسلام کا جلسہ ہو رہا تھا کہ کسی نے ایک خط آپکو دیا کہ آپکی جان سخت خطرہ میں ہے۔ آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "اگر میں پاکستان کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو میں تمھیں رسولؐ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری لاش کو ہندوستان نہ لیجانا بلکہ پاکستان کے قلب میں مجھ کو دفن کرنا کیونکہ میرے نزدیک پاکستان کی سرزمین ہندوستان کی سرزمین سے بہتر ہے۔"

[۱۳] جناح کی تقاریر۔ انگریزی جمیل الدین احمد۔ جلد ۲ ص: ۲۷۷

[۱۴] عصر جدید کلکتہ۔ ۱۴ر اپریل ۱۹۴۶ء [۱۵] ظفر احمد تھانوی۔ انوار النظر۔ لاہور ۱۹۵۸ء ص: ۶۵۔ [۱۶] نوائے وقت یکم جولائی ۱۹۴۷ء

[۱۷] انوار النظر۔ ص ۷۰ [۱۸] ماہنامہ الحق۔ فروری ۱۹۶۹ء۔ ص: ۱۴

کرتے ہوئے فرمایا:

"بلاشبہ مسلم لیگ اور اس کے قائد میں انسانی کمزوریاں ہیں اور ان کی بہت سی باتیں ہمارے علمائے کے نزدیک قابلِ اعتراض ہیں۔ جہاں تک میں اپنی بساط کے مطابق اندازہ کرسکا ہوں مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح آجکل کی سیاست کے داؤ پیچ سے مسلمانوں میں سب سے زیادہ واقف ہیں۔ پھر نہ وہ کسی قیمت پر خریدا جا سکتا ہے نہ کسی دباؤ کے سامنے سر جھکا سکتا ہے۔"[۹]

ایک دوسرے موقع پر قائد اعظم کے مخالفین کو جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"یہ داڑھی منڈے گنہگار سہی مسلمان تو ہیں۔ ہم ان سے وقت آنے پر خدا اور رسولؐ کا واسطہ دے کر مذہب کے نام پر ان کو خاموش تو کروا سکتے ہیں۔ ہم کو یہ بتلاؤ کہ گاندھی اور نہرو کو کس کا واسطہ دے کر تم خاموش کروا سکتے ہو؟ میں نے مسٹر جناح کو قائد اعظم کیوں مانا ہے؟ موجودہ سیاست کو انگریزوں نے جھوٹ فریب میں رنگ دیا ہے۔ محمد علی جناح ایک کامیاب بیرسٹر ہیں وہی جانتے ہیں کہ ہندوؤں اور انگریزوں کے مکر و فریب کا جواب کس طرح ان ہی کی زبان میں دیا جائے۔ قوم نے ان کو اپنا وکیل بنا کے کھڑا کیا ہے۔ اس راہ میں وہ ہماری قیادت کر رہے ہیں۔"[۱۰]

ایک مولانا صاحب نے ایک خط میں مولانا شبیر احمدؒ عثمانی کو لکھا:

"مجھ کو آپ کے اس لکھنے سے کہ جناح کو ہندوستان کا سیاسی لیڈر تسلیم کیا جائے بڑا دکھ ہوا۔"

مولانا عثمانی نے جواب میں تحریر فرمایا:

"مسٹر جناح کی قیادت کا مسئلہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے ان کو ابتداءً اپنا لیڈر نہیں بنایا وہ اپنی دماغی قابلیت یا دوسرے تکوینی اسباب کی بناء پر مسلم اکثریت کے قائد بن گئے اب ان کا مقابلہ کر کے جماعت مسلمین میں تفرقہ ڈالنا درآنحالیکہ وہ اس وقت ایک مضبوط اصول اور صحیح نظریہ کے حامل بھی ہیں کیسے درست ہو سکتا ہے۔"[۸]

کابینہ مشن ۱۹۴۶ء

۱۹ر فروری کو لارڈ لارنس نے دارالامراء میں اور مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ ہندوستان کا مسئلہ طے کرنے کے لئے ایک وزارتی وفد ہندوستان بھیجا جائے گا۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں برطانوی کابینہ نے اس اعلان کے تحت تین آدمیوں پر مشتمل ایک وفد ہندوستان روانہ کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے دستوری تشکیل کا کوئی طریقہ سوچ کر نکالے۔[۱۱]

۱۵ر مارچ ۴۶ء کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ ایٹلی نے کہا: "ہم کو اقلیتوں کے حقوق کا خیال ہے اور اقلیتوں کو اس لائق ہونا چاہیئے کہ وہ خوف سے آزاد رہ سکیں مگر دوسری طرف ہم یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ اقلیت اکثر کی ترقی کے خلاف اختیارِ امتناع (ویٹو) استعمال کرے۔"[۱۲]

اس اعلان سے کانگریس بہت خوش ہوئی اور کانگریس کے بہت سے اخباروں نے خیال کیا کہ اب برطانیہ نے آخر کار مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ قائد اعظم نے فوراً اس تقریر کے جواب میں فرمایا:

"یہاں اختیارِ امتناع برتنے کا سوال نہیں یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ایک مثال چسپاں ہوتی ہے کہ ایک مکڑی نے مکھی سے کہا کہ میرے محل میں آ جاؤ۔ اب اگر مکھی انکار کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اختیارِ امتناع برتا جا رہا ہے اور مکھی ضدی ہے ــ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہماری یہ معین حیثیت ہے کہ ہم ہندوستان کی تقسیم چاہتے ہیں اور پاکستان قائم کرنا

---

[۹] پیغام شیخ الاسلام۔ ص ۲۲ [۱۰] عصر جدید کلکتہ۔ ۲۷ر اپریل ۱۹۴۶ء۔ [۸] مراسلات سیاسیہ۔ آل انڈیا مسلم لیگ۔ دہلی۔

[۱۱] اشتیاق حسین قریشی۔ برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ۔ کراچی ۱۹۶۷ ص ۳۹۲ [۱۲] سید حسن ریاض۔ پاکستان ناگزیر تھا۔ کراچی ۱۹۶۷ء ص ۳۸۳

"پاکستان مسلمانوں کا پیدائشی حق ہے"

مولانا عثمانی نے اپنی تقاریر میں بے شمار جگہ شرعی نقطۂ نظر سے نظریۂ پاکستان کو صحیح قرار دیا۔ ۱۸ مئی ۱۹۴۶ء کو جمعیۃ علمائے اسلام کے زیرِ اہتمام ضلع اعظم گڑھ میں ایک عظیم الشان کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"پاکستان مسلمانوں کا پیدائشی حق ہے کہ اس وقت انگریز اور ہندو دونوں پاکستان کو نہیں مانتے لیکن ایسا وقت آئے گا جب یہ دونوں قومیں از خود پاکستان دے دیں گی۔ لیکن اسکے لئے ہم کو اپنے بھُولے ہوئے فریضے اسلامی جہاد کو پھر سے یاد کر کے عمل کرنا ہوگا۔" ۵؎

بمبئی میں پہلی جمیعۃ علمائے اسلام کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

"پاکستان نہ کوئی نعرہ ہے نہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفی قدم۔ یہ نفرت کی پیداوار نہیں جیسا کہ کہا جارہا ہے۔ یہ نظریہ اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ مختلف صوبوں میں کانگریسی وزارت کے قیام کے بعد لاہور میں قرارداد منظور کی گئی۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ قرارداد لاہور کا مطالعہ کریں آپ پر حقیقت منکشف ہوجائے گی۔ ہندوستان ہم لوگوں کا ہے۔ برطانوی حکمرانوں کو چاہیئے کہ وہ اسے مسلمانوں کے حوالے کردے۔ کوئی الحال ہم صرف ایک تہائی حصّہ کے خواستگار ہیں۔" ۶؎

اُردو پارک دہلی میں نواب قدیر الدین کی زیرِ صدارت مسلم لیگ کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"مسلمان اس کے قائل نہیں کہ حکومت بعد از آزادی ہندوؤں کو مل جائے اور مسلمان ان کے محتاج ہوجائیں۔ مسلمانوں نے اس مطالبۂ پاکستان کو بروقت پیش کردیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو بیک وقت آزادی مل جائے۔"

مسلمانوں کو ہدایت کرتے ہوئے فرمایا:

"میرے بھائیو یاد رکھو کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لو اور سمجھ لو یہ دیکھو کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے خواہ کہنے والا کوئی ہو اور اگر تمھارے مفاد کی بات پیش کرے تو اس کو قبول کرلو۔"

"متحدہ ہندوستان" کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم کو بتلایا جائے کہ ایک مرکز کے تحت ہمارے مفاد کا تحفظ کیا ہوگا۔ ایک مرکز میں ہم یقینی طور پر اقلیت میں ہونگے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم اپنی مسجدیں' تاریخی عمارتیں اور یادگار چیزیں غیر مسلموں کے حوالے کر کے جانے کے لئے تیار نہیں۔ میں پوچھتا ہُوں کہ جب ہم کو ہجرت کا حکم دیا جاتا تھا یا ہم اپنی ضرورت سے ہجرت کرتے تھے تو کیا اپنی مسجدیں اپنے گھر اور ساری اشیاء اپنے سروں پر لاد کرلیجاتے تھے۔ ہم سب اپنی چیزیں خدا کے سپرد کر جاتے تھے! اور اس خدا کا فضل و کرم تھا کہ بعد میں ہم کو سب کچھ مل جاتا تھا۔" ۷؎

مولانا عثمانی نے مسلم لیگ کے لئے جو قربانیاں دیں۔ اپنی عمر کے آخری حصّے میں ملک کے ہر حصّے کے دورے کئے اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ جس کا اجلاس ۳ جون ۱۹۴۷ء کو دہلی میں منعقد ہوا' مولانا عثمانی کو اس میں شرکت کی خاص دعوت دی گئی۔ ۸؎

قائدِ اعظم جناحؒ اور مولانا عثمانیؒ

قائدِ اعظم محمد علی جناح پر مخالف علماء کی طرف سے بیحد الزامات عائد کئے جاتے تھے۔ رات دن اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی چھوٹی سی بات ہاتھ آجائے پھر اس کا پہاڑ بنایا جائے۔ مولانا عثمانی نے قائدِ اعظم کے متعلق الزامات کی طرف اشارہ

۵؎ عصرِ جدید کلکتہ۔ یکم جون ۱۹۴۶ء ۶؎ ایضاً۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۶ء ۷؎ ایضاً۔ ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء

۸؎ ایضاً۔ ۴ جون ۱۹۴۶ء۔

فیوضِ یزدانی ترجمہ للفتح الربانی

مؤلف: حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رح ٭ ترجمہ: مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رح

مواعظ حسنہ کا وہ بیش بہا ذخیرہ جس نے لاکھوں انسانوں کی زندگیاں بدل کر انھیں سچا مومن بنا دیا، تصوف جیسے پیچیدہ اور مشکل مسئلے کو حضرت پیران پیر رح نے جس عمدگی سے سمجھا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اصل کتاب عربی میں تھی ہم نے شرعی طور پر ترجمہ کی طباعت کے حقوق حاصل کر کے عمدہ کتابت اور طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ ایک کالم میں عربی متن، مقابل کالم میں سلیس اردو ترجمہ۔ تصوف کے موضوع پر ایسی مدلل جامع اور بےنظیر کتاب دوسری نہیں مل سکتی۔

سائز: ۳۰×۲۰-۸ ضخامت: ۶۷۶ صفحات، دورنگہ حسین سنہرا سرورق قیمت مجلد ۱۵/ روپے

مصنفہ: حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رح

حضرت مولانا مرحوم کی یہ قابلِ قدر کتاب عرصہ سے نایاب تھی۔ مولانا مرحوم نے اس کتاب کو اس طرح تالیف کیا ہے کہ اسلام اور اس کی تاریخ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اور وہ تمام اہم اور ضروری معلومات جن کا علم قاری کے لئے ضروری ہے نہایت دلنشیں انداز میں اس کتاب میں موجود ہیں۔ قافلۂ اسلام کن کن دشوار گذار راہوں سے گذرا ہے، یہ کتاب اس کے جلال و جمال کی شاندار تاریخی دستاویز ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ دیدہ زیب ہے، کاغذ سفید گلیز، سائز ۲۶×۲۰/۸، ضخامت ۳۹۲ صفحات دو رنگہ حسین گرد پوش، قیمت مجلد دس روپے۔

ملنے کا پتہ: **مدینہ پبلشنگ کمپنی**۔ بندر روڈ۔ کراچی ۱ء

شیخ سرور الصبّان کا مکتوب

پاکستانی بھائیوں کے نام!

رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری شیخ سرور الصبان کا یہ مکتوب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کے نام پچھلے مہینے موصول ہوا ہے۔ اگرچہ اس کا موضوع مارشل لاء سے قبل پاکستان کو حالات ہیں، لیکن جس دردمندی کے ساتھ اس میں پاکستانی مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کی تلقین کی گئی ہے وہ ہمارے لئے ہر دور میں فکر انگیز ہے، اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسرے اسلامی ممالک کے رہنما پاکستان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اسلئے مکتوب کا ملخص ترجمہ پیش خدمت ہے۔

برادران پاکستان!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ،

پاکستان میں کچھ عرصہ سے جو خلفشار برپا ہے، اس نے ہمارے اور عالم اسلام کے ہر باغیرت مسلمان کے دل میں شدید قلق و اضطراب پیدا کیا ہوا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان اس وقت اسلام اور مسلمانوں کا ایک بلند اور مضبوط حصار ہے۔ ہمیں ہر وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ کہیں مسلمانوں کا یہ مضبوط حصار ہمارے باہمی افتراق کی وجہ سے ان لوگوں کی شکار گاہ نہ بنجائے جو اسکے امن اور استحکام سے کھیلنا چاہتے ہیں۔

آپ حضرات نے اس قلعے کو اپنے سچے ایمان، اتحاد اور بیش بہا قربانیوں کے ذریعہ مضبوط کیا ہے اور اب تک آپ صرف ایک مقصد پر دل و جان سے متحد رہے ہیں ــ کہ اسلام غالب ہو اور مسلمانوں کے عقائد محفوظ رہیں۔ ساری دنیا میں آپ کے جو بھائی آباد ہیں، ان کے کلیجے یہ دیکھ کر شق ہو رہے ہیں کہ اب انکے پاکستانی بھائی باہمی افتراق کا شکار ہو رہے۔

جس وقت یہودیوں نے سازش کر کے صحابہ کرامؓ کے درمیان خانہ جنگی کا بیج بونے کی کوشش کی تھی اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی تھی:

> "اے گروہ انصار! یہ کیا قصہ ہے؟ کیا میرے ہوتے ہوئے تم جاہلیت کی حمیت لوٹانا چاہتے ہو۔ میرے بعد تم کفر کی طرف مت لوٹ جانا کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگو۔"

آپ لوگوں نے عالم اسلام کے اس محبوب خطے میں اسلام کی حمایت کا علم بلند کیا ہے، اس لئے اگر سارے عالم اسلام نے خدا کے بعد آپ سے امیدیں وابستہ کی ہوئی ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مسلمانوں کو یہ توقع ہے کہ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ عالم اسلام کو فتنوں سے نجات دیگا۔ اور وہ اصلاح و تعمیر کی شاہراہ پر تیزی سے گامزن ہوں گے۔

یاد رکھیے کہ وہ نئے نعرے جو مسلمانوں کی صفوں میں چھوڑے گئے ہیں وہ دشمنان اسلام نے صرف اس مقصد کے لئے چھوڑے

ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈال کر ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیں۔

ہم اپنے پاکستانی بھائیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے دین، اپنے وطن اور اپنی وحدت کی خاطر خدا سے ڈریں اور اس خطرے کے مقابلے کے لئے متحد ہو جائیں جو ان دنوں پاکستان پر چھایا ہوا ہے، آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر خدا نکردہ یہ فتنے کامیاب ہو گئے تو عالم اسلام کا کوئی گوشہ ان کے شر سے مامون نہیں رہے گا۔

یہ نہ بھولئے کہ پاکستان ترقی کے جس مقام پر آج پہنچا ہوا ہے، وہ اسے خالص اللہ کے فضل سے حاصل ہوا ہے، اور اسکی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ پوری ملت ہمیشہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حفاظت کے لئے متحد، مثل اور بیکجہ ایثار بنی رہی ہے۔ یہ اللہ کا بڑا احسان ہے جس پر پاکستان کے باشندوں کو فخر کرنا چاہیئے، اور اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اسلام اور توحید کے پرچم تلے ان کا یہ اتحاد ہمیشہ برقرار رہے۔

خدا کے لئے افتراق وانتشار کے موجودہ دروازوں کو بند کرنے میں تاخیر سے کام نہ لیجئے۔ اور وقت ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے ہی اس سے فائدہ اٹھا لیجئے۔ اور اللہ کی اس پکار پر پھر سے جمع ہو جائیے:

يا ايها الذين آمنوا استجيبوا لله وللرسول اذا دعاكم
لما يحييكم واعلموا أن الله يحول بين المرء وقلبه وانه
إليه تحشرون، واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا
منكم خاصة واعلموا ان الله شديد العقاب واذكروا
اذ أنتم قليل مستضعفون في الأرض تخافون
أن يتخطفكم الناس فآواكم وأيدكم بنصره ورزقكم
من الطيبات لعلكم تشكرون۔

"اے ایمان والو! جب اللہ اور رسول تمھیں ایسی بات کی طرف بلائیں جو تمھاری زندگی کا باعث ہے تو تم ان کی بات قبول کرو اور جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے درمیان حائل ہے۔ اور اسی کی طرف تمھیں جمع کیا جائیگا اور ڈرو اس آزمائش میں جو تم میں سے صرف ظالموں کو نہیں پکڑیگی اور جان لو کہ اللہ شدید عذاب دینے والا ہے، اور یاد کرو اس وقت کو جب تم زمین میں تھوڑے اور ضعیف تھے، تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمھیں دبوچ نہ لیں، تو اللہ نے تمھیں ٹھکانہ دیا اور اپنی نصرت سے تمھاری تائید کی اور اچھی اچھی رزق تمھیں عطا کی تاکہ تم شکر کرو۔"

اللہ تعالیٰ ہم سب کو لغزشوں سے بچائے اور پاکستان کی حفاظت کرے۔ وہ پاکستان جو اب تک اسلام کا قلعہ اور مسلمانوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

والسلام

محمد سرور الصبّان

ناظم اعلیٰ رابطۂ عالم اسلامی

عبرتؔ صدیقی
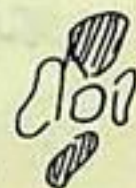
انوارِ خدا حسنِ نبیؐ دیکھ رہا ہوں
جو دل کی تمنا ہے وہی دیکھ رہا ہوں

اب اور کہیں جائیں شبِ غم کے اندھیرے
میں صبحِ گلستانِ نبیؐ دیکھ رہا ہوں

ہے پیشِ نظر روضۂ سرکار کی جالی
اک مرکزِ صد جلوہ گری دیکھ رہا ہوں

سرچشمۂ انوار ہے طیبہ کا تخیّل
بہتی ہوئی جلووں کی ندی دیکھ رہا ہوں

پہنچی ہے درِ ساقیٔ کوثر پہ مری بات
یہ رنگ بھی اے تشنہ لبی دیکھ رہا ہوں

انوار کا عالم ہے ہر اک نقش یہاں کا
دنیا ہی مدینہ میں نئی دیکھ رہا ہوں

صہبائے خلوص اشکِ الم مستیٔ کوثر
کیا شئے مری آنکھوں سے ڈھلی دیکھ رہا ہوں

فطرت ہی بدل دی ہے غمِ عشقِ نبیؐ نے
ہر اشک میں دنیائے خوشی دیکھ رہا ہوں

لائی ہے مدینے سے یہ مہکا کے مقدر
اندازِ نسیمِ سحری دیکھ رہا ہوں

روضے کو مری چشمِ طلب چوم رہی ہے!
جلووں میں نظر ڈوبی ہوئی دیکھ رہا ہوں

ہے پیشِ نظر کعبۂ ایمان و عقیدت
نقشِ قدمِ پاکِ نبیؐ دیکھ رہا ہوں

دل عرشِ تجلّی ہے نظر مرکزِ جلوہ
تاثیرِ غمِ عشقِ نبیؐ دیکھ رہا ہوں

عبرتؔ ہے مرے پیشِ نظر دفترِ عصیاں
کردار مرا کیا ہے یہی دیکھ رہا ہوں

مدنی اصلی بہشتی زیور مکمل

مصنفہ:

حضرت حکیم الامت علامہ اشرف علی تھانوی رح

یہ شہرۂ آفاق تصنیف جس میں پیدائش سے لیکر موت تک پیش آنے والے جملہ مسائل مثلاً اولاد کی تربیت بڑے چھوٹے کے حقوق و فرائض، شادی بیاہ کی اسلامی و غیر اسلامی رسومات کی وضاحت وغیرہ کی مکمل تفصیل درج ہے ابتک لاکھوں کی تعداد میں طبع ہو چکی ہے، ہم نے کتابت و طباعت اور تصحیح کے انتہائی اہتمام کے بعد آفسٹ کے ذریعہ طبع کیا ہے جس کی وجہ سے دیگر اداروں کے مطبوعہ نسخوں سے بیحد ممتاز ہے۔ ہر صفحہ پر خوشنما بیل ہے۔ شادی کے موقع پر جہیز میں دینے کے لئے خاص طور پر "جہیز ایڈیشن" دو رنگوں میں عمدہ سفید کاغذ پر طبع کیا ہے۔

سائز ۲۶×۲۰/۸، ضخامت ۸۰۴ صفحات دو رنگہ آرٹ پیپر پر مطبوعہ گرد پوش۔

قیمت: (جہیز ایڈیشن مع پلاسٹک کور) -/۱۵ روپے علاوہ محصول ڈاک، عام ایڈیشن (مجلد مع دو رنگہ گرد پوش) ۷/۵۰

ترجمان السنّۃ (جلد چہارم)

مؤلفہ:

قطب العارفین حضرت مولانا سید بدر عالم مہاجر مدنی قدس اللہ سرہٗ

حضرت علامہ کی علمیت و بزرگی محتاج تعارف نہیں آپ نے اس کتاب میں معجزات کی حقیقت اور اسانید پر ایسا جامع مبسوط اور سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے جو دوسری کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا، منکرین حدیث کے لئے تازیانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ علماء اور عوام دونوں حلقوں میں بیحد مقبول ہے۔ کتاب کیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ کتابت عمدہ خوشخط اور طباعت دیدہ زیب، چار رنگہ سرورق جس کی خوبصورتی میں روضۂ مبارک کے مکمل نقشے نے چار چاند لگا دیئے ہیں، سائز ۸/۲۹×۲۲، ضخامت ۴۲۸ صفحات

قیمت قسم اول مجلد: -/۱۵ روپے ٭ قیمت قسم دوم مجلد: -/۱۲ روپے ٭

ملنے کا پتہ

مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی ۱

افادات: مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ
پیشکش: ادارہ

مقامِ محبّت

عشق ہی زندگی کا سوز عشق ہی زندگی کا ساز

جن باطنی اعمال کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے ان میں سے ایک اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

والذین آمنوا أشد حبا للہ

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا یؤمن أحدکم حتی یکون اللہ ورسولہ احب إلیہ مما سواھما (او کما قال)

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اللہ اور اس کا رسول اس کے لئے ہر ماسوا سے زیادہ محبوب نہ ہو جائے۔"

ان آیات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کی تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے۔

محبت کا دعویٰ کر دینا تو بہت آسان ہے اور ہر شخص یہ زبانی خدمت انجام دے سکتا ہے لیکن ؎

وکلٌّ یدّعی حبّاً للیلی ولیلی لا تقر لھم بذاکا

اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ محبت کی کچھ حقیقت بھی دل میں موجود ہے یا نہیں۔ دنیا کی ہر چیز کی طرح محبت کی بھی ایک علامت ہے اور وہ علامت ہے محبوب کی اطاعت! ع

إنّ المحبّ لمن یحبّ مطیع

اسی حقیقت کو قرآن کریم نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:

"قل إن کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ"

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب رکھے گا

اب سوال یہ ہے کہ یہ محبت حاصل کیسے ہو؟ اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو دوسری محبتوں سے خالی کرے۔ صوفیاء کرامؒ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ قلب ایک ایسا برتن ہے جس میں دو چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں دل کو اللہ تعالیٰ نے خالصتاً اپنے ہی لئے بنایا ہے۔ اب اگر یہ دل دنیا کی اور جاہ و مال کی محبت سے بھرا ہوا ہو تو اس میں اللہ کی محبت کیسے آئے؟

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ ایک مرتبہ خانقاہی گھر

جا رہے تھے، مجھے بھی اس طرف جانا تھا، میں بھی ساتھ ہو لیا، راستے میں چلتے چلتے اچانک رُکے اور جیب سے کاغذ اور پنسل نکالی پھر کچھ لکھ کر اسے جیب میں ڈال لیا۔ پھر خود ہی مجھ سے پوچھا "سمجھے مولوی شفیع! کیا بات ہوئی؟" میں نے انکار کیا تو فرمایا کہ: "دل کا بوجھ کاغذ پر ڈال دیا، ایک کام یاد آیا تھا جو خانقاہ میں واپس آکر کرنا ہے۔ نہ لکھتا تو دل میں کھٹکتا رہتا، اب دل فارغ ہے۔" پھر فرمایا کہ: "دل کو اللہ نے اپنے لئے ہی بنایا ہے۔"

لہٰذا دل کا صحیح مصرف اللہ کی یاد ہے، بقدرِ ضرورت دیگر اشیاء کے خیال میں مضائقہ نہیں، لیکن دل کو دُنیوی امور ہی کی محبت اور انہی کی فکر سے معمور رکھنا غلط ہے۔ انبیاء و اولیاء میں اور ہم میں فرق یہی ہے کہ دنیوی کام وہ بھی کرتے تھے اور ہم بھی کرتے ہیں، مگر وہ "دست بکار و دل بیار" کے مصداق تھے۔ خالص دُنیا کے کام انجام دیتے وقت بھی ان کا قلب اللہ کے ذکر اور اس کی یاد میں محو ہوتا تھا، اس کے برعکس ہمارا حال یہ ہے کہ ان کاموں میں ہمارے ہاتھ پاؤں تو کم صرف ہوتے ہیں مگر دل ہر وقت دُنیا ہی میں مشغول رہتا ہے۔

حضرت صدیقہ عائشہؓ سے کسی نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کیسی تھی؟ انھوں نے فرمایا کہ آپؐ اسی طرح گھر میں تشریف لاتے تھے جس طرح دُنیا کے سب مرد، لیکن فرق یہ ہے کہ تمام دنیوی امور انجام دینے کے ساتھ ساتھ جب کان میں اذان کی آواز پڑتی تھی تو:

مرّ کأن لم یعرفنا

اس طرح اٹھ کر چلے جاتے تھے جیسے ہمیں پہچانتے ہی نہیں۔

مشہور محدث امام ابو داؤدؒ کے اساتذہ میں سے ایک بزرگ حدّاد (لوہار) تھے، ان کا معمول یہ تھا کہ گرم لوہے پر ضربیں لگاتے لگاتے جس وقت اذان کی آواز کان میں پڑتی تو اگر ہتھوڑا سر سے اُوپر اُٹھایا ہوا ہوتا تو اسے وہیں پیچھے کی طرف چھوڑ دیتے تھے اور اس ایک ضرب کو کام میں لانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بڑی خطیر رقم صرف کر کے ایک باغ لگایا تھا، ایک دن دیکھ بھال کے لئے باغ میں گئے ذرا فرصت ملی تو نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ایک پرندہ آکر کھجوروں کے خوشوں میں الجھ گیا۔ اور پھڑ پھڑانے لگا حضرت طلحہؓ کی نگاہ اس پر پڑی تو ذہن کچھ دیر کے لئے نماز سے ہٹ کر اس طرف متوجہ ہو گیا۔ سلام پھیرا تو تنبہ ہوا اور جا کر حضرت عثمانؓ سے کہا کہ یہ باغ مجھے اللہ کی یاد سے غافل کرتا ہے اس لئے میں اسے صدقہ کرتا ہوں۔ اُس زمانے میں یہ باغ نو ہزار میں فروخت ہوا۔
(موطا امام مالکؒ)

تو اللہ کی محبت حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ دل کو غیر اللہ کی محبت سے فارغ کیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسرا طریقہ "معرفت" کی کوشش ہے۔ عقلی طور پر انسان غور کرے تو کسی کے ساتھ محبت کرنے کے عموماً چار اسباب ہوتے ہیں: حُسن و جمال، فضل و کمال، مُلک و مال اور جود و نوال اور یہ چاروں چیزیں ذاتِ باری تعالیٰ میں اس درجہ مکمل طور پر پائی جاتی ہیں کہ کسی اور میں نہیں پائی جا سکتیں، مخلوقات میں جہاں کہیں ان میں سے کوئی چیز موجود ہے وہ اللہ ہی کی عطا کردہ ہے لہٰذا عقلاً اللہ سے زیادہ محبوبیت کا مستحق کوئی نہیں۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ:

من عرف الله لم یحب غیره و
من عرف الدنیا زهد فیه

جسے اللہ کی معرفت حاصل ہو وہ اس کے سوا کسی سے محبت نہیں کرے گا اور جو شخص دنیا کی حقیقت پہچان لے وہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرے گا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کا ہر ذرہ معرفتِ حق کا راستہ ہے۔ جس مخلوق پر بھی تفصیلی نگاہ ڈالو، وہ اپنے خالق کی عظمت پر دلالت کرے گی۔ (باقی صفحہ ۴۸ پر)

خواتین اسلام سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں

مولانا محمد عاشق الٰہی برنی
(اُستاذ دارالعلوم۔ کراچی)

حدیث نمبر: ۳۶

وعن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال کان الفضل ردیف النبیّ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فجاءت امرءۃ من خثعم فجعل الفضل ینظر الیہا وتنظر الیہ فجعل النبیّ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یصرف وجہ الفضل الی الشقّ الاٰخر فقالت اِنّ فریضۃ اللہ ادرکت اَبی شیخًا کبیرًا لا یثبت علی الرّاحلۃ اُفاُحجّ عنہ؟ قال نعم وذالک فی حجۃ الوداع۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر (مزدلفہ سے منیٰ کو واپس ہوتے ہوئے) فضل بن عباسؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری پر پیچھے بیٹھے ہوئے تھے اس اثنا میں قبیلہ بنی خثعم کی ایک عورت (مسئلہ معلوم کرنے کے لئے) بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئی۔ فضل بن عباسؓ اس عورت کو دیکھنے لگے۔ اور وہ عورت ان کو دیکھنے لگی۔ (چونکہ بدنظری مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے سخت منع ہے اور حج جیسی عبادت کے موقع پر گناہ کا ارتکاب اور زیادہ سنگین ہے اس لئے) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فضل بن عباسؓ کا چہرہ پکڑ کر دوسری طرف کو پھیر دیا (جس سے دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے محفوظ ہوگئے) اس کے بعد اُس عورت نے رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ بلاشبہ اللہ کا فریضہ یعنی حج میرے بوڑھے باپ کے ذمے لازم ہوگیا ہے (اور وہ اس قدر بوڑھے اور ضعیف ہیں کہ) سواری پر جم کر نہیں بیٹھ سکتے ہیں تو کیا میں ان کی طرف سے حج کرلوں؟ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ہاں (باپ کی طرف سے حج کرلو)۔ (بخاری شریف ص ۲۰۵)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سفر حج میں مردوں اور عورتوں کو بدنظری سے بچنے کا خاص اہتمام کرنا لازم ہے۔ مسند احمد میں یہ حدیث اس طرح نقل کی گئی ہے کہ (حج کے موقع پر) عرفہ کے دن ایک (نوجوان) شخص آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ آپؐ کی سواری پر آپؐ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا وہ نوجوان عورتوں پر نظریں ڈالنے لگا تو آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے برادرزادے بلاشبہ یہ وہ دن ہے کہ جو شخص (آج) اپنے کانوں اور آنکھوں کو اور اپنی زبان کو قابو میں رکھے گا (یعنی ان اعضاء کو گناہوں

سے بچائے گا، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا۔ (الترغیب والترہیب)۔

حدیث نمبر: ۳۷

وعن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت کان الرکبان یمرون بنا ونحن محرمات مع رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فاذا حاذوا بنا سدلت احدنا جلبابہا من رأسہا فاذا جاوزونا کشفناہ (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ (سفر حج میں) ہمارے قریب سے حاجی لوگ گذرتے تھے اور ہم رسول اللہ تعالیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احرام باندھے ہوئے تھیں (چونکہ احرام میں عورت کو منہ پر کپڑا لگانا منع ہے اس لئے ہمارے چہرے کھلے ہوئے تھے اور چونکہ پردہ کرنا حج میں بھی لازم ہے) اس لئے جب حاجی لوگ ہمارے برابر گذرتے تو ہم بڑی سی چادر کو سر سے گرا کر چہرے کے سامنے لٹکا لیتے اور جب حاجی لوگ آگے بڑھ جاتے تو ہم لوگ چہرہ کھول لیتے تھے (ابوداؤد شریف۔ ص: ۲۵۴)

تشریح: اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ سفر حج میں پردے کا اہتمام کرنا لازم ہے۔ عورت جب حج کا احرام باندھ لے تو احرام کھولنے تک چہرے پر کپڑا لگانا منع ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ چہرہ کھولے ہوئے حاجیوں کے سامنے پھرتی رہیں۔ ایسی صورت اختیار کرنا ضروری ہے کہ چہرے پر کپڑا بھی نہ لگے اور نامحرموں سے پردہ بھی ہو جائے۔ جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے سفر حج کا واقعہ بیان فرمایا۔ جو حدیث بالا میں مذکور ہے۔ اس واقعہ سے بھی ان مغرب زدہ مجتہدین کے قول کی تردید ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ چہرہ کھولنا نامحرموں کے سامنے جائز ہے۔ اسی لئے نقاب والا برقعہ اپنی عورتوں کو نہیں اڑھاتے۔ اگر نامحرموں سے چہرہ چھپانا لازم نہ ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دیگر صحابی عورتیں حاجی لوگوں سے چہرہ چھپانے کا کیوں اہتمام کرتیں؟

آجکل حاجی لوگ آپس میں عرفاتی بھائی بن جاتے ہیں اور حاجی اور حجن عرفاتی بھائی بہن کہلانے لگتے ہیں اور جب بھائی بہن بن گئے تو پورے سفر حج میں حجنیں نامحرم حاجیوں کے سامنے بلا تکلف بے پردہ آتی جاتی اور اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ یہ جہالت ہے۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ بے پردگی سفر حج میں بھی ممنوع ہے اور اس کے بعد بھی ممنوع ہے نامحرم بہر حال نامحرم ہے چاہے صوفی جی اور پیر جی ہوں، چاہے نمازی جی اور حاجی جی ہوں۔ خوب سمجھ لو۔

حدیث نمبر: ۳۸

وعن قیس بن شماس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال جاءت امرأۃ الی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقال لہا ام خلاد وہی متنقبۃ تسأل عن ابنہا وہو مقتول فقال لہا بعض اصحاب النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جئت تسألین عن ابنک وانت متنقبۃ فقالت ان أرزأ ابنی فلن ارزأ حیائی فقال رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابنک لہ اجر شہیدین قالت ولم ذاک یا رسول اللہ؟ قال لأنہ قتلہ اہل الکتاب (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت قیس بن شماس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ ایک صحابی عورت جنکو ام خلادؓ کہا جاتا تھا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے بیٹے کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہوئیں۔ ان کا بیٹا (کسی غزوہ میں) شہید ہوگیا تھا۔ جب وہ آئیں تو اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے تھیں انکا یہ حال دیکھ کر کسی صحابی نے کہا کہ تم اپنے بیٹے کا حال معلوم کرنے آئی ہو اور نقاب ڈالے ہوئے ہو حضرت ام خلادؓ نے جواب دیا کہ اگر بیٹے کے بارے میں مصیبت زدہ ہوگئی ہوں تو اپنی شرم و حیا کھو کر ہرگز دوہری مصیبت میں نہ پڑونگی۔ (یعنی حیا کا چلا جانا ایسی ہی مصیبت زدہ کر دینے والی چیز ہے جیسے بیٹے کا ختم ہو جانا) حضرت ام خلادؓ کے پوچھنے پر حضور

اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ تمھارے بیٹے کو دو شہیدوں کا ثواب ہوگا۔ عرض کیا یا رسول اللہ کیوں؟ ارشاد فرمایا اس لئے کہ اسے اہل کتاب نے قتل کیا ہے (ابوداؤد شریف۔ ص: ۳۳۷)

تشریح: اس واقعہ سے بھی ان مغربیت زدہ مجتہدین کی تردید ہوتی ہے جو چہرے کو پردے سے خارج کہتے ہیں اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پردہ ہر حال میں لازم ہے رنج ہو یا خوشی نامحرم کے سامنے بے پردہ ہو کر آنا منع ہے۔ بہت سے مرد اور عورت ایسا طرز اختیار کرتے ہیں کہ گویا ان کے نزدیک شریعت کا کوئی قانون مصیبت کے وقت لاگو نہیں ہے جب گھر میں کوئی موت ہو جائیگی تو اس بات کو جانتے ہوئے کہ نوحہ کرنا سخت منع ہے عورتیں زور زور سے نوحہ کرتی ہیں۔ جنازہ جب گھر سے باہر نکالا جاتا ہے تو عورتیں دروازے کے باہر تک اس کے پیچھے چلی آتی ہیں اور پردے کا کچھ خیال نہیں کرتیں۔ خوب یاد رکھو غصہ ہو یا رضامندی خوشی ہو یا مصیبت ہر حال میں سب پر احکام شریعت کی پابندی کرنا لازم ہے۔

●

پبلشر :- مفتی محمد شفیع دار العلوم کراچی نمبر ۱۴ پرنٹر :- مشہور پریس کراچی